تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا تہذیبی تناظر

محقق:

فاطمہ بتول

229-FLL/MSURDU/F17

نگران:

ڈاکٹر شیراز فضل داد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD.

Accession No TH25036

MS
891.4391
ف 11

اردو ادب

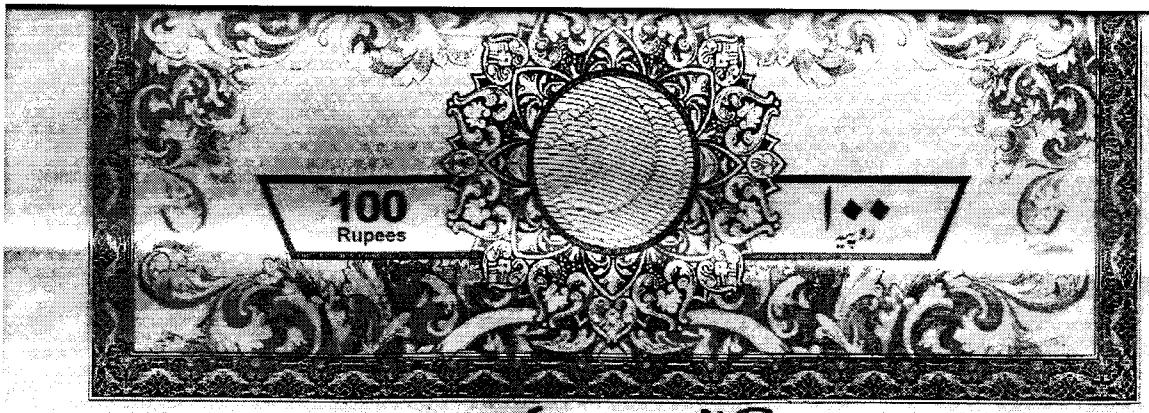

100
Rupees
۱۰۰
روپیہ

بیانِ حلفی

منکہ فاطمہ بتول دختر سید اختر علی شاہ ساکن [illegible]

[illegible] حلفاً بیان کرتی ہوں کہ میرا مقالہ

بعنوان "[illegible] شیرازی کی [illegible] نظموں کا تنقیدی [illegible]"

میرا ہے۔ اس مقالے میں مکمل اور اصل مواد [illegible]

[illegible] شعبہ اردو ڈاکٹر شمیم [illegible]

کی زیر نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

میں حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ میں نے یہ تمام کام اپنی محنت [illegible]

[illegible] ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا گیا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] 25/12/21

16204-0600864-2

Fatima

فاطمہ بتول دختر سید اختر علی شاہ

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ فاطمہ بتول رجسٹریشن نمبر 229-FLL/MSURDU/F17 نے ایم۔ایس۔اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"اختر شیرانی کی رومانوی نظموں کا تہذیبی تناظر"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر شیراز فضل داد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Fatima Batool**

Title of the Thesis: اختر شیرانی کی رومانوی نظموں کا تہذیبی تناظر

Registration No: **229-FLL/MSURD/F17**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Saeed Ahmed,Associate Professor, Department of Urdu,

Internal Examiner:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

Supervisor:

Dr. Shiraz Fazal Dad,
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

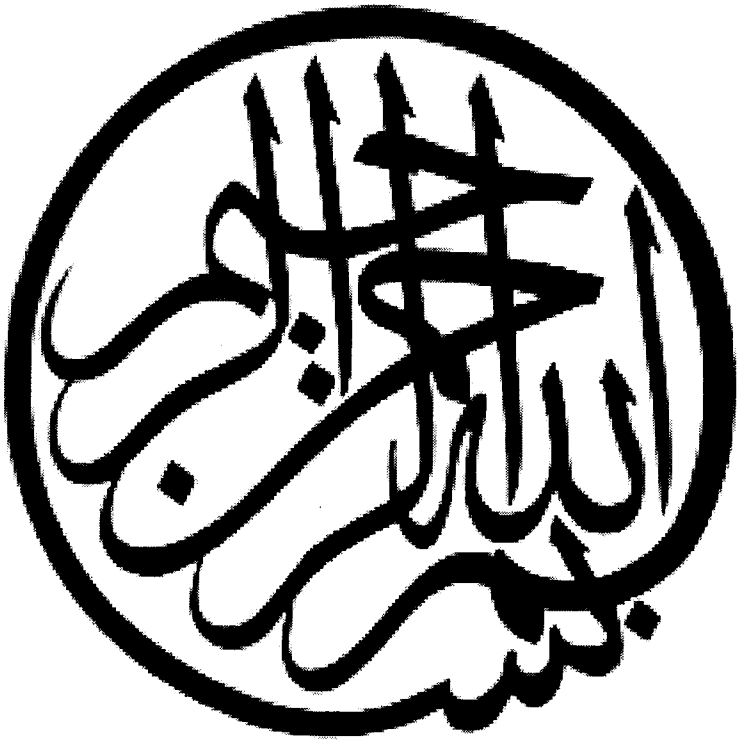
بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

تحقیق کا لفظ ذہن میں آتے ہی دھیان ان دقیقوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جو اس فن کی راہ میں کانٹوں کی طرح بچھے ہوئے ہیں۔ معلوم سے نامعلوم اور یقین سے موہوم تک کے سفر میں زندگی کو اس مروجہ ضابطوں سے ہٹ کر برتنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تحقیق کسی نوع کی ہو، اس کا سفر جاری رہتا ہے۔ تحقیق میں کبھی ایک رائے قائم نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے۔ وہ بات جس کو ہم آج اپنی دانست میں درست اور مکمل سمجھ کر حرف آخر ثابت کرنے پر تلے بیٹھے ہیں آئندہ زمانے میں محض حرف آغاز بھی ہو سکتی ہے۔

اختر شیرانی کا شمار اپنے دور کے مقبول ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ رومانیت کی بنیادی خصوصیات کو اختر کی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان کو رومانی شاعر کہا گیا۔ رومانی شاعر سے ہٹ کر اپنے دور کے سیاسی، سماجی مسائل سے بھی خود کو باخبر رکھا۔ اس لیے رومانی عنصر کے علاوہ ان کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اختر چوں کہ شاعر رومان کی حیثیت سے ابھرے اس وجہ سے ان کی شاعری کے دوسرے پہلو پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس مقالے میں اختر شیرانی کی رومانوی نظموں کا تہذیبی تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے تہذیبی روایات سے ہٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا اور اس کا بخوبی انداز اختر کی نظموں سے لگایا جا سکتا ہے۔

مقالے لکھنے سے پہلے کالج اور یونی ورسٹی کے نصابی کتب میں اختر شیرانی کی حالات زندگی اور نظموں کا مطالعہ کیا تھا اور ذہن میں صرف ایک بات بیٹھ گئی تھی کہ اختر ایک رومانی شاعر ہے۔ جب مقالے کے عنوان کی بات آئی تو میری نہایت شفیق اور قابل محترم استاد ڈاکٹر شیراز فضل داد نے نہایت خوش دلی سے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت دے دی اور یہ بھی بتایا کہ اختر کی رومانیت پر بہت سے محققین نے کام کیا ہے۔ آپ اس کی رومانی نظموں کا تہذیبی تناظر پر تحقیق کرو۔ میری نگران ڈاکٹر شیراز فضل داد نے اس تحقیقی مقالے کا نام "اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا تہذیبی تناظر" تجویز کیا۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں تمدن، کلچر،، ثقافت اور تہذیب کی تعریف بیان کی گئی ہے اور ان میں فرق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ تہذیب و ثقافت کے مختلف عناصر کی تعریف اور مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ ساتھ میں اردو زبان کا مختصر تعارف اور اردو نظم گو شعرا کی نظموں کا تہذیبی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں اختر شیرانی کی سوانح حیات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ سماج کی تعریف سماجی تعلقات کو اختر کی نظموں میں واضح کیا گیا ہے۔ ساتھ میں اختر کی نظموں میں عشق و محبت کے عناصر کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں ہندستان میں رسم رواج کا پس منظر، اختر کی نظموں میں رسم و رواج اور تاریخ کی عکاسی کو سامنے لایا گیا ہے۔

باب چہارم میں فن کی تعریف فن کی ابتدا اور اقسام فنون بتائے گئے ہیں اس ساتھ ساتھ اختر کی نظموں میں فنون لطیفہ کی پیش کش کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

مقالہ لکھتے وقت پورے انصاف سے کام مکمل کرنے کی کوشش کی ہے میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ جس نے میری مدد کی۔ میں نے اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ تحقیقی کام میں اہم مرحلہ ماخذات تک رسائی ہے اور اس مرحلے میں میری نگران ڈاکٹر شیراز فضل داد نے میری بھرپور مدد کی۔ نگران کی بھرپور معاونت اور رہنمائی سے تحقیقی کام مکمل ہوا۔

ایم۔ایس کے اساتذہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق، ڈاکٹر سائرہ بتول، ڈاکٹر صباحت مشتاق، ڈاکٹر شیراز فضل داد، ڈاکٹر انعام الحق غازی اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ان سب کی انتہائی ممنون ہوں ان تمام شخصیات سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ان سے پڑھنا میرے لیے باعث اعزاز ہے۔ والدین کی شفقت اور محبت کا قرض کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ اپنی والدہ کی شکر گزار ہوں جنھوں نے زندگی کے ہر مرحلے میں میرا حوصلہ بڑھایا اور میری ڈھال بن کر میرے ساتھ کھڑی رہی ہیں۔ اپنی کالج کولیگ زینب، طاہرہ اور سمانواز کی بے حد ممنون ہو جنھوں نے مقالے میں پیش آنے والی مشکلات کو حل کیا۔ اپنی دوست مہرینہ مریم کی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے میری بھرپور مدد کی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں جنھوں میرا ساتھ دیا، رب کریم ان کے دامن خوشیوں سے بھر دے (آمین)

فاطمہ بتول

اگست ۲۰۲۱ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	مقدمہ	
۱۔	باب اوّل:	
	تہذیب وثقافت کے عناصر اور اردو نظم میں اس کا اظہار	۱
	حوالہ جات	۲۴
۲۔	باب دوم:	
	اختر شیرانی کی نظموں میں سماجی تعلقات اور عشق ومحبت کے سلوک کی عکاسی	۲۶
	حوالہ جات	۶۰
۳۔	باب سوم:	
	اختر شیرانی کی نظموں میں رسم ورواج اور تاریخ کا جائزہ	۶۳
	حوالہ جات	۸۴
۴۔	باب چہارم:	
	اختر شیرانی کی نظموں میں فنون لطیفہ کی عکاسی	۸۶
	حوالہ جات	۱۰۰
	ماحصل	۱۰۲
	کتابیات	۱۰۶

باب اوّل:

تہذیب و ثقافت کے عناصر اور اردو نظم میں اس کا اظہار

تہذیب ایک بہت ہی اہم لفظ ہے۔ صبح و شام کئی دفعہ ہم اپنے رویوں سے اپنی تہذیب کا اعادہ اور مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ایسا بالکل لاشعوری طور پر ہوتا ہے۔ ہمارا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، بات کرنے کا سلیقہ، نشست و برخاست ، ہماری عادتیں غرض ہر صورت میں ہماری تہذیبی رویوں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ یہ سب ہمارے خون میں اس طرح گھل مل جاتی ہیں کہ ہم ان سب پر غور ہی نہیں کرتے اور یوں تہذیب ہمارے سامنے ہو کر بھی ہم سے چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بات جتنی کل اہم تھی اتنی آج بھی ہے کہ لفظ تہذیب کی جامع تعریف کی جائے اور اس کے حدود اور مختلف عناصر ترکیبی کو سامنے لایا جائے۔

کسی مجرد لفظ کی تعریف ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ پھر وہ لفظ جس کے دائرہ اختیار میں ایک سے زیادہ مفہوم شامل ہیں اور جو ہمیشہ اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک ہی معنی کو ادا کرنے کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ مختلف الفاظ مفہوم کے اعتبار سے الگ الگ بھی ہیں اور ان کے تانے بانے آپس میں اس طرح ملتے بھی ہیں کہ ان کو علیحدہ خانوں میں تقسیم کرنا آسان نہیں اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ تقسیم صرف کتاب اور کاغذ کی حد تک ہو گی۔ عملی طور پر جس مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش میں ہیں اس کی ادائیگی کے لیے عام طور پر چار الفاظ مروج ہیں مثال کے طور پر تمدن، ثقافت، کلچر اور تہذیب۔ یہ الفاظ تھوڑے بہت فرق کے باوجود بھی ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ تہذیب کی تعریف سے پہلے ان کے فرق کو واضح کرنا ضروری ہے۔

ا۔ تمدن:

مصباح اللغات میں تمدن کے معنی ہیں۔

مل کے رہنے کا طریقہ، طرز معاشرت (مدن۔ شہر میں آنا یا رہنا)[1]

تمدن کے لغوی معنی سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا اور انسانی طرز معاشرت یعنی انسان کے رہنے کا طریقہ کیسا ہے؟ اس کے لیے شہر بسانا اور شہری زندگی دو اہم باتیں ہیں۔ تمدن وہ اصطلاح ہے جو جنگلیوں اور وحشیوں کے مقابلے میں ترقی یافتہ لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جب کوئی خطہ یا اس کے لوگ مہذب اور ترقی یافتہ ہو تو اس کے بارے میں عموماً "متمدن قوم" کی رائے دی جاتی ہے۔

محمد راشد بھٹی اپنی کتاب مطالعہ تہذیب اسلامی میں لکھتے ہیں کہ

تمدن لفظ مدن سے ہے جس کے معنی اقامت کرنا، شریت اختیار کرنا، شہر بسانا اور معاشرے میں رہنے کے ہیں۔ اس لفظ سے "مدینہ" ہے۔ جس کے معنی شہر کے ہیں۔ چناچہ تمدن کسی ملک یا مقام کی طرز معاشرت کا نام ہے جسے انگریزی زبان میں Social State یا Civilization کہتے ہیں۔[۲]

تمدن کے لیے شہر کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ جو لوگ شہر میں نہ ہو ان کی کوئی تہذیب نہیں ہوتی۔ بہت پہلے جب شہروں کا کوئی تصور نہیں تھا اور انسان غاروں میں قیام پذیر تھا تو اس وقت بھی غاروں کا انسان اپنی ایک الگ قسم کی تہذیبی شناخت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ثالث نے بدویت کو تمدن کی چار دیواری میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اپنی بیویوں اور بچوں کے عالیشان مکانات بنوائے۔ مسجد نبوی کی جو عمارت کھڑی تھی اس میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ عمارتوں میں نقش و نگار اور دیواروں پہ چاندی کے کام کا آغاز ہوا۔ ولید بن عبدالملک کا نام بھی اس حوالے سے فراموش نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ انہوں نے شاندار عمارتیں خوبصورت اور وسیع مساجد اور مسجد نبوی کو آراستہ کیا۔ اس کا فرش سنگ مرمر کا بنایا۔ اس طرح ان عالم دین شخصیات نے متمدن زندگی کے لیے راستہ ہموار کیا۔

سبط حسن تمدن کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں۔

تمدن کی بنیاد شہری زندگی ہے۔ تمدن اس وقت وجود میں آتا ہے جب شہر وجود میں آتے ہیں۔ دراصل تمدن نام ہی ان رشتوں کی تنظیم کا ہے جو شہری زندگی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ خواہ یہ تنظیم انسان کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتی ہو یا انسان اور مادی چیزوں کے باہمی ربط سے وابستہ ہو۔ یہی تنظیم آگے چل کر ریاستی نظام کی اساس بنتی ہے تحریر کا رواج بھی تمدن ہی کا مظہر ہے کیوں کہ وہ معاشرہ جو فن تحریر سے ناواقف ہو مہذب کہا جا سکتا ہے لیکن متمدن نہیں کہا جا سکتا۔[۳]

شہر اور تمدن دونوں ایک ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ معاشرے کے تمام جاندار چاہے وہ انسان ہو یا جانور ان کا آپس میں باہمی تعلق ہوتا ہے۔ اس سے ایک جماعت وجود میں آتی ہے۔ پھر یہی جماعت آگے چل کر ایک اعلیٰ درجے کی ریاست کی بنیاد بنتی ہے۔ تحریر و تقریر متمدن زندگی کا اہم عنصر ہے۔ اس کے بغیر معاشرے کے لوگ مہذب تو ہو سکتے ہیں پر متمدن نہیں۔ تمدن سے مراد انسان کی ترقی و کامرانی ہوتی ہے۔ جب ہم کسی ملک یا قوم کو انسانیت سے بھرا

ہوا، ترقی یافتہ، خوش و خرم، پاک وصاف، تعلیم یافتہ اور دانش مند وزیرک دیکھتے ہیں تو ہم اسے متمدن قوم سے تعبیر کرتے ہیں تحریر اور ادب تمدن قوم کی ذیل میں آتی ہیں کیوں کہ جہاں ادب پروان چڑھتا ہے وہاں لوگ خود بخود متمدن ہو جاتے ہیں۔ تحریر وادب کے بغیر کوئی بھی قوم متمدن نہیں ہو سکتی۔

بقول محمد احد علی:

> تمدن کا خاص مفہوم یہ ہے کہ اس سے صرف ایک قطع خاص کی ترقی مراد لی جائے جیسے وحشیوں اور جنگلیوں کے مقابلے میں ایک دولت منداور زبردست قوم متمدن سمجھی جاتی ہے۔[۴]

انسان جب غاروں میں اپنی زندگی گزارتا تھا تو اس وقت شہری زندگی کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن جب وقت گزرتا گیا اور انسان ایجادات اور ترقی کے منازل طے کرتا گیا تو انسان نے اپنی سہولت اور آسانی کے لیے غاروں کی بجائے بڑے گھر بنائے۔ پھر مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے وقت کے ساتھ عالیشان عبادت گاہیں بنائی۔ جب لوگوں کے پاس مال و دولت زیادہ ہوا تو وہاں لوگوں نے خود کو اور بھی مضبوط بنایا۔ پہلے جو کہاوتیں، زبانی داستانیں اور کہانیاں ہوتی تھیں۔ اب وہ تحریری شکل میں بدلتی گئیں۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ متمدن قوم وجود میں آنا شروع ہو گئی۔

۲۔ کلچر:

غلام جیلانی برق کلچر کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> کلچر انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں، ہل چلانا، پالنا، ترتیب دینا اور قوائے ذہنی کو چمکانا (تعلیم مطالعہ اور مشاہدہ سے) کسی کھیت میں ہل چلا کر اس کو نرم کرنا، کھاد ڈالنا، بیکار بوٹیوں کا اکھاڑنا اور اسے پانی دینا۔[۵]

کلچر کا ماخذ KULT ہے رومن میں KULT کو کھیتی باڑی کے علاوہ مذہبی عقائد اور ذہنی تربیت کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ دیکھا جائے تو اس کا جھکاو روحانیت کی طرف ہے۔ کلچر میں دو چیزوں کا امتزاج ملتا ہے۔ اس میں انسان کی مادی اور روحانی دو طرح کی تہذیبوں کا عکس نظر آتا ہے۔ یعنی اس میں کھانا پینا، لباس، آلات واوزار ہی نہیں بلکہ اخلاق، علم و دانش، فلسفہ اور مذہب بھی شامل ہیں۔ تمدن کی نسبت کلچر تہذیب کے زیادہ قریب تر معلوم ہوئی ہے۔

کلچر ہماری زندگی کی ساری سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ چاہے وہ ذہنی سرگرمی ہو یا مادی، خارجی یا پھر داخلی۔ اس کو برتنے سے انسان وحشیانہ پن اور انسانیت میں فرق کر سکتا ہے۔ کلچر میں علم وہنر کو فروغ دینا، علوم وفنون کو اعلیٰ

درجے تک پہنچانا، برے کاموں سے اجتناب کرنا، حسد اور تنگ نظری سے دور رہنا، غیرت وخودداری کو اپنانا، معاشرے میں امن وامان پھیلانا، اچھے عادات اپنانا، روایات کو عزت دینا، اور نرم لہجہ اختیار کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ جس طرح ایک صحرا میں پانی کے بغیر زندگی ممکن نہیں ویسے کلچر کے بغیر انسانی معاشرہ گونگا اور بہرہ ہے۔ اور جیسے انسانی جسم روح کے بغیر ایک مردہ شے ہے ویسے کلچر کے بغیر یہ معاشرہ بے جان ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں کلچر کی تعریف ان الفاظ میں ہوئی ہے۔

> The term culture assumed its meaning in application to the variety of things that might be cultivated. The term culture and cult have the same derivation and were Appied by the romans to the cultivation of mind and the cultivation of relgion and God: .[۵]

۳۔ ثقافت:

تہذیب کے ساتھ ساتھ ایک لفظ ثقافت بھی ملتا ہے۔ یہ لفظ تہذیب کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ لسان العرب کے مطابق

> ثقافت کی اصل ثقف ہے۔ جس کے معنی ذہین صاف ستھرے اور مہذب ہونے کے ہیں۔ کسی چیز کو جلدی سیکھ جانے کو بھی ثقافت کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ جب کہ اس سے مراد کسی شے پر غلبہ پانے اور معرفت والا ہونے کے بھی ہیں۔[۶]

دنیا میں جو بھی علوم ہیں وہ ثقافت کے زمرے میں آتے ہیں۔ اصطلاح میں ثقافت سے مراد وہ علم اور دانائی ہے جو تاریخ کے واقعات، فن حدیث اور علمائے کرام سے حاصل کی جائے۔ انگریزی میں ثقافت کے لیے کلچر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کسی معاشرے میں رہنے والے افراد کی طرز زندگی اور تمدن کو بھی ثقافت کہتے ہیں۔ کسی علاقے کے مذہبی عقائد، تہذیبی اقدار، رنگ ونسل طرز زندگی، زبان اور لباس اور ذرائع مواصلات ثقافت کی وسعت اور ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ترقی کے اثرات اور ان ذرائع میں ردوبدل انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں اور اس طرح لوگوں کے طریق زندگی بدلنے سے ثقافت بھی نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ چاہے یہ رنگ اس کے بنیادی رنگ (Origin) سے کسی قدر مختلف کیوں نہ ہو۔

انگریزی روزنامہ The Nation کے ۳۱ اگست ۱۹۹۵ء کے ادارتی صفحہ میں ثقافت کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے۔

Culture is the sum total ,how the people in a society live their non-economic and Non political life. it comprises among other thing, the way they wish to celebrate their religious and other festivals ,the things they like to do or to observe to entertain themselves the language or the languages they use to communicate with each other ect.[۸]

تہذیب اگر ایک درخت ہے تو اس کی شاخیں ثقافت ہیں۔ان دونوں میں ایک خاص تعلق ہے۔ثقافت کی وجہ سے تہذیب کے فنا ہونے کے بعد بھی اسے زندہ دیکھا جاسکتا ہے۔دونوں میں فرق کے باوجود ان کے درمیان کوئی واضح لکیر نہیں کھینچی جاسکتی۔

۴: تہذیب:

سبط حسن تہذیب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے۔جس کے لغوی معنی ہیں کسی درخت یا پودے کو کاٹنا، چھانٹنا، تراشنا تاکہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھوٹیں۔[۹]

فارسی میں تہذیب کے معنی ہیں آراستن و پیراستن، پاک و درست و اصلاح نمودن۔یہ لفظ اصطلاح میں شائستگی کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اس میں کردار گفتار کی شائستگی بھی شامل ہے۔

کسی تہذیب کے بننے میں اس کے عہد کے ہر فرد کی شراکت ہوتی ہے۔چاہے وہ عام شخص ہو یا خاص۔ہر شخص اس کا معمار اور کاریگر ہوتا ہے۔یہ کسی ایک فرد واحد کے ذریعے وجود میں نہیں آتی نہ تہذیب کے لیے کسی مقام کی کوئی قید و بند ہوتی ہے۔اس کا وجود ہر عہد اور ہر صدی میں کسی نہ کسی شکل میں واضح نظر آتا ہے۔

سبط حسن اپنی کتاب ماضی کے مزار میں تہذیب کے بارے میں کہتے ہیں:

> تہذیب کے لیے کسی شہر، دیہات، صحرا اور کوہستان کی کوئی قید نہیں کیوں کہ تہذیب معاشرے کی اجتماعی تخلیقات اور اقدار کا نچوڑ ہوتی ہے۔اس لیے تہذیب کے آثار ہر معاشرے میں ملتے ہیں۔خواہ وہ غاروں میں رہنے والے نیم وحشی قبیلوں کا معاشرہ ہو یا صحراوں میں مارے مارے پھرنے والے خانہ بدوشوں کا معاشرہ ہو۔چنانچہ تہذیب اس زمانے میں بھی موجود تھی جب انسان پتھر کے آلات و اوزار استعمال کرتا تھا اور جنگلی پھلوں اور جنگلی جانوروں کے شکار پر زندگی بسر کرتا تھا۔[۱۰]

زمانہ قدیم سے لے کر موجودہ دور تک تہذیب کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ لفظ تہذیب کے اندر ان گنت چیزیں آتی ہیں جو انسانی زندگی کی بنیاد ہیں۔ جس میں انسان کی حرکات، انسانی گفتگو کا انداز، عقائد، خیالات، اخلاق وادب، رہن سہن، عبادت اور سیاست وغیرہ شامل ہیں۔ ابتدا سے لے کر دور حاضر تک انسان نے اپنی خوشی اور آرام کے لیے کچھ اصول بنائے ہیں اور یہ ہی اصول اس کی تہذیب کہلائی۔

تہذیب کی عمر اتنی چھوٹی نہیں نہ ہی اتنی بڑی ہے اس کی عمر اتنی ہے کہ جتنی خود انسان کی عمر ہے۔ انسان جب پیدا ہوا تو اس کو وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جن کی مدد سے وہ اپنی زندگی کو آسان بناتا بلکہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر جانوروں کا شکار کرتا تھا اور نباتات کھانے پر گزارہ کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ انسان نے اپنے فائدے کے لیے آگ پیدا کرنے کی اوزار دریافت کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ رشتے بنائے جیسے ماں، باپ، بہن بھائی وغیرہ۔ اسی دن سے انسان کی تہذیبی زندگی کا آغاز ہوا۔ وقت کے ساتھ انسانی زہن اور قول و فعل میں مہذبانہ عکس دکھائی دینے لگا۔

سر سید خان تہذیب کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> جب ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر رہتا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان کی حاجتیں، ان کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں، ان کے معلومات اور ان کے خیالات، ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہے اور اس لیے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں ہوتے ہیں اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے۔ اور یہ ہی مجموعی خواہش سے تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولیزشین ہے۔[1]

ہر خطے اور علاقے کی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسرے خطے یا علاقے سے منفرد نظر آتی ہے۔ اگر کوئی خطہ اپنی تہذیبی ڈھانچہ برقرار رکھے تو وہ کبھی مٹتا ہے نہ اس کو زوال آتا ہے۔ یہاں تک دوسری قومیں اسی تہذیب سے اس قوم کی شناخت کرتی ہیں۔ جو قومیں اپنی تہذیب کو بھول جاتی ہیں تو ان کی مثال اس کھوئے ہوئے بچے کی طرح ہے جو بھرے بازار میں اپنی ماں سے کھو جاتا ہے جسے سوائے رونے کے کچھ نہیں آتا۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ تہذیب کو انسان نے تخلیق کیا ہے اور انسان کے تجربات کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انسان فطرت کے آگے بے بس ہے۔ انسان جتنا بھی ہاتھ پاوں مارے وکہیں نہ کہیں فطرت کے کارناموں کے آگے جھکتا ہے۔ اگر خارجی حالات انسان کے لیے بہتر ہیں تو وہ تہذیب کو آگے لے جاسکتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں تہذیبی عمل میں رکاوٹ پھر لازمی ہے۔ تہذیب انسانی معاشرے کو زندہ اور متحرک رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے بغیر معاشرے کی مثال اس بے جان جسم کی طرح ہے جس میں جان نہ ہو۔ یہ ایک تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ جو معاشرے کے افراد کو تازگی کا احساس دلاتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ان چار الفاظ کی معنی ایک نہیں ان میں کچھ خصوصیات ایک جیسے لیکن فرق بھی نظر آتا ہے۔ آیا وہ فرق معمولی کیوں نہ ہو۔

بقول غلام جیلانی برق:

> ثقافت، تمدن، اور کلچر خاص ہیں۔ ثقافت کا تعلق علوم وفنون سے ہے۔ تمدن کا عمارات و باغات سے ہے۔ کلچر کا دانش ذہنی تصورات اور ایمانات سے جب کہ تہذیب ایک عام چیز ہے جو ان تینوں پر حاوی ہے۔[12]

تہذیب و ثقافت کے عناصر:

دنیا کی ہر چیز مختلف عناصر سے مل کر بنتی ہے۔ جیسے انسانی جسم میں مختلف عضو ہوتے ہیں۔ اس طرح ہماری زندگی خوشی غم پانی آگ ہوا اور موت پر مشتمل ہے۔ اس کائنات کو دیکھا جائے تو یہ بھی مختلف چیزوں کا مرکب ہے مثال کے طور پر انسان، حیوان پانی آگ پہاڑ وغیرہ۔

لفظ تہذیب کے کچھ عناصر ایسے ہیں جو شروع سے آرہے ہیں اور ان سے تہذیب کا وجود وقوع پذیر ہوا ہے پذیر ہوا ہے۔ سبط حسن نے اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقا میں ان کو بیان کیا ہے۔ یہ عناصر مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ سماجی تعلقات:

سماج کے معنی معاشرہ کے ہیں۔ افراد کے ایسے گروہ کو جو کافی عرصہ سے ایک جگہ رہ رہا ہو۔ فروز اللغات کے مطابق سماج کے معنی ہیں کہ "معاشرہ، سوسائٹی، انجمن، کمیٹی محفل، گروہ، ٹولی۔"[13]

حضرت محمدؐ وہ ہستی ہیں جنہوں نے سماج کو زندہ وجود قرار دیا۔ بخاری و مسلم کی ایک حدیث ہے جس کا ترجمہ درجہ ذیل ہے:

> ترجمہ: باہمی مودت، صلہ رحمی اور ہمدردی کے معاملے میں مومنوں کی مثال ایسے ہے جیسے ایک زندہ جسم۔ اس کا ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہو تو سارے جسم کو بخار اور بے آرامی میں رہنا پڑتا ہے۔[14]

سبط حسن سماجی اقدار کے حوالے سے اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقا میں رقمطراز ہیں کہ:

> کسی معاشرے میں روابط و سلوک، اخلاق و عادات، طرز بود ماند، رسم و راج، حسن و جمال اور فن و اظہار فن کے جو معیار رائج ہوئے ہیں وہی اس معاشرے کے سماجی اقدار کہلاتے ہیں۔[15]

معاشرہ افراد کے ایک ایسے گروہ کو کہا جاتا ہے کہ جس کی بنیادی ضروریات زندگی میں ایک دوسرے سے مشترکہ روابط موجود ہوں۔ معاشرے کی تعریف کے مطابق یہ لازمی نہیں کہ ان کا تعلق ایک ہی قوم یا ایک ہی مذہب سے ہو۔ سماجی تعلقات کے بغیر کوئی بھی معاشرہ آگے نہیں جاسکتا سماجی تعلقات معاشرے کو جوڑے رکھتا ہے۔ مہمان نوازی، رحم دلی، فن کاروں کی عزت، شادی بیاہ اور مذہبی تہواروں میں خوشی اور موت یا غم پر افسوس کا اظہار یہ ساری چیزیں سماجی تعلقات کی ذیل میں آتے ہیں۔

۲۔ عشق و محبت:

فیروز اللغات کے مطابق عشق کے معنی ہیں کہ:

محبت، پریم، پیار، چاہ، شوق، خواہش، عادت، لت۔[۱۶]

فیروز واللغات میں محبت کا مفہوم یہ ہے کہ:

الفت، پیار، چاہ، دوستی، یارانہ، عشق، لگن۔[۱۷]

عشق و محبت کے سلوک تہذیب کا ایک عنصر ہے۔ کسی خطے میں اگر انسان رہتے ہیں تو ان کی کاروبار زندگی کے لیے اہم چیز عشق و محبت ہے۔ انسان کے علاوہ جانور بھی اس جذبے کی بدولت ایک دوسرے سے مانوس ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے اگر اسے کسی معاشرے سے نکال دیا جائے تو اس معاشرے کی مثال ایک ویران جنگل جیسی ہوگی۔

عشق و محبت کا تعلق انسان سے بہت گہرا ہے۔ محبت کا جذبہ انسان کے اندر مخفی خصوصیات کو سامنے لاتی ہے اور یہ انسانی عزائم کی بلندی کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ شاعر اسٹیل نے اپنی محبوبہ لیڈی الزبتھ کی محبت کے حوالے سے کہا ہے کہ ''وہ صرف اس کی محبت ہی میرے لیے وسیع بہترین معلم ثابت ہو سکتی ہے۔

مجنوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب مجنوں کا عشق آخری درجے تک پہنچا تو اس سے کسی نے کہا: کہ دیکھ لیلیٰ آرہی ہے۔ مجنوں چونک پڑا اور کہا: میں ہی تو لیلیٰ ہوں اور لیلیٰ مجھ میں ہی تو ہے۔ عشق کے درجے پہ پہنچ کر انسان سے اپنا آپ گم ہوتا جاتا ہے اور پھر وہ خود میں محبوب کو دیکھتا ہے۔ عشق کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ عشق حقیقی

۲۔ عشق مجازی

عشق حقیقی سے مراد اللہ تعالیٰ سے عشق ہے اور جس شخص کو عشق حقیقی کا نشہ چڑھ جاتا ہے وہ انسان دنیاوی محبت کو بھول جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ پر اپنی وحی نازل فرمائی تھی کہ جب میں انسان کے دل میں واقف ہوتا ہوں تو

میں اس کے دل میں دنیا اور آخرت کی محبت نہیں پاتا اور اس کے قلب کو اپنی محبت سے بھر دیتا ہوں۔ سچے عاشق کی علامت یہ ہے کہ اس کی نظر میں محبوب کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں سماتا۔ وہ ساری دنیا سے قطع تعلق کر کے خدا کے سامنے جھک جاتا ہے۔ اس کا مقصود اور مطلاب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہو جاتا ہے جو انسان خدا کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے پھر وہ صرف خدا کا طالب بن جاتا ہے۔ اللہ کی ذات سے عشق کرنا عشق حقیقی ہے۔ جس میں نہ کوئی شکایت ہے نہ جدا ہونے کی تکلیف، نہ گناہ کا ڈر اور نہ رسوائی کی فکر۔ یہ عشق جاودانی ہے۔

انسان سے محبت کا نام عشق مجازی ہے۔ یہ وہ محبت ہے جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔ اس میں فرد اپنے دل میں دوسرے انسان کے لیے جگہ بناتا ہے۔ وصال و فراق، ہجر میں ہنسنا، وصال کی خوشی وغیرہ اس کے بنیادی عناصر ہیں۔ اس میں کبھی تو عاشق کو بے پناہ ساتھ اور خوشی ملتی ہے اور کبھی ہجر کے دکھ اور معشوق سے جدائی۔ اس میں معشوق کبھی کبھی اپنے عاشق پر فریفتہ جاتا ہے اور محبت کا جواب محبت میں دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس میں ایک اور کردار بھی آتا اور وہ ہے رقیب۔ یہ ایک ایسا عشق ہے جس میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ انگریزی اور اردو ادب کی نثر و شاعری میں اس کا ذکر کثیر مقدار میں ملتا ہے۔

عشق وہ قوت ہے جسے اپنا کر انسان عروج کی طرف جاتا ہے اور زوال اس کو چھو کر نہیں گزرتا۔ عظیم پیغمبر حضرت ابراہیم کو نمرود نے آگ میں ڈالا اسے خدا سے عشق تھا۔ اگر اس کے دل میں عشق کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ کبھی خود کو آگ کے حوالے نہ کرتا۔ حالاں کہ خدا نے ان پر کرم کر کے وہ آگ آپ پر گلزار بنا دی۔ یہ سب عشق کے جذبے کی بدولت تھا۔ عشق اپنی راہ میں کوئی روکاوٹ اور دیوار نہیں دیکھتا نہ تند و تیز سیلاب سے نہ زمانے کے گرم و سرد سے ڈرتا ہے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ محبت جیسا لطیف جذبہ اس زمین کے ہر ذی روح مخلوق میں موجود ہے۔ محبت صرف مرد اور عورت کے مابین نہیں ہوتی بلکہ محبت کی مختلف صورتیں ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ سے محبت، پیغمبروں سے محبت اپنے رشتے داروں سے محبت وغیرہ۔ اگر انسان اپنی محبت میں ہر حد پار کرے اور دیوانگی کی حالت پہ پہنچ جائے تو یہ عشق ہے۔ جب انسان عشق کے درجے پر پہنچ جاتا ہے تو وہاں نفع و نقصان کی باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔

بقول علامہ اقبال:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں[18]

۳۔رسم ورواج:

فیروز االلغات میں رسم ورواج کے معنی ہیں:

دستور۔ قاعدہ۔ روایت۔[19]

رسم ورواج سماجی زندگی کی علامت ہوا کرتے ہیں اور تہذیب کے اجتماعی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہر قوم کی انفرادی، واجتماعی زندگی میں ان رسوم ورواج کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور تہذیب وثقافت، اخلاق وعادات مذہبی عقائد، ذہنی رجحانات اور طرز معاشرت پر ان کا گہرا اثر پڑتا ہے۔

کسی بھی معاشرے میں جہاں لوگوں کی آبادی ہو تو رسم ورواج بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے ہونے سے کسی تہذیب کے مرنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ کچھ روایات اور رسم ورواج ایسے ہوتے ہیں جن سے نہ صرف کسی معاشرے کی شناخت ہوتی ہے بلکہ اس جگہ کے لوگ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔

۴۔تاریخ:

فیروز االلغات میں تاریخ کے معنی ہیں۔

۱۔ ایک دن رات۔ مہینے کا ایک دن

۲۔ کسی چیز کا ظہور

۳۔ وہ کتاب جس میں بادشاہوں اور مشہور آدمیوں کی حالات زندگی درج ہو۔

۴۔ کسی ملک یا قوم کے ماضی وحال کا سچا تذکرہ۔[20]

تاریخ تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے۔ اصطلاح میں تاریخ اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے بادشاہوں، فاتحوں اور مشاہیر کے احوال، گزرے ہوئے زمانے کے بڑے اور عظیم الشان واقعات وحوادت، زمانہ گزشتہ کی معاشرت، تمدن اور اخلاق وغیرہ سے واقفیت حاصل کی جاتی ہے جنگوں اور امور سلطنت، تہذیب وتمدن، حکومتوں کے قیام عروج وزوال کو بھی تاریخ کہا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ جو حالات وواقعات بقید وقت لکھے جاتے ہیں۔ ان کو تاریخ کہتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں تاریخ کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے۔

Study that traditionally has aimed at pvoviding an over all explaination of the process of history.[21]

تاریخ وہ علم ہے جس کے ذریعے بادشاہوں، نبیوں، فاتحین اور مشہور شخصیات کے حالات اور گزرے ہوئے مختلف زمانوں کے عظیم الشان واقعات وتعلقات وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس علم کے ذریعے گزشتہ زمانے کی

معاشرت، اخلاق اور تمدن سے بھی واقفیت ملتی ہے۔ تاریخ سے پچھلے اقوام کے عروج و زوال تعمیر و تخریب کے احوال تک رسائی ملتی ہے۔ اس سے آئندہ نسلوں کے لیے عبرت کا سامان بھی میسر آتا ہے۔ حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ دانائی اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ دل و دماغ میں تازگی و نشو نما کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ عرض تاریخ اس کائنات کا پس منظر بھی ہے اور پیش منظر بھی۔

۵۔ فنون لطیفہ:

فیروز االلغات میں فنون لطیفہ کے معنی ہیں۔

پاکیزہ، سبک اور عمدہ فنون، موسیقی، شعر ادب، تعمیرات، بت تراشی، مصوری۔[۲۲]

فنون لطیفہ جمالیاتی حس کے اظہار کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ فنون لطیفہ سے مراد جذبات کا اظہار ہے اور دل کو چھو لینے والی کسی تخلیق کا جنم لینا ہے۔ چاہے یہ کسی بھی صورت میں ہو۔ شاعری، مصوری مجسمہ سازی تصویر کشی تعمیرا ت، موسیقی تھیٹر، فلم اور رقص جیسے شعبوں کو فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

اپنے خیال کو ہنر مندی سے پیش کرنے کا نام آرٹ ہے۔ اب چاہے اس کا اظہار کسی بھی شکل میں ہو۔ آرٹ انسانی جذبات واحسات کو دوسرے تک پہنچانے کا ایک اہم اور کامیاب کوشش ہے۔ یونان کے عظیم ڈرامہ نگار اور فلسفی ارسطو نے آرٹ کو نقل قرار دیا ہے۔ ہر ادیب، ہر شاعر، ہر معمار اور ہر مصور کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے فن کی بدولت اپنے زمانے کی تمام تعاویر کی واضح طور پر سامنے لائے ہیں اور اس طرح اپنے معاشرے کی اصلاح کرتا ہے۔ فنکار اس جماعت کے احساسات اور خیالات کا عکس ہوتا ہے۔ جہاں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ فنون لطیفہ میں جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر آرٹسٹ خود اپنے کام میں عملی طور پر محو نہ کر دے تو وہ کسی دوسرے کو متاثر نہیں کر سکتا۔ آرٹ کا کوئی مقصد ہونا چاہیے کیوں کہ بے مقصد آرٹ قوموں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا۔

اردو زبان اور اس کی نظم میں تہذیب و ثقافت کے عناصر کی عکاسی

زبان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قیمتی تحفہ ہے اس کے ذریعے ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں سے ہم کلام ہوتے ہیں۔انسان نے ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک ،اپنے احساسات، خیالات ،جذبات اور ضروریات کے لیے کوئی نہ کوئی زبان ایجاد کی ہے۔اس کے ذریعے لوگ رابطے میں رہتے ہیں۔ انسان احساسات، خیالات ،جذبات اور ضروریات دوسروں تک پہنچانے کے لیے زبان کا سہارا لیتا ہے۔ زمانہ قدیم سے مختلف زبانیں وجود میں آئیں ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کچھ زبانیں وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوئیں اور کچھ ترقی کی منازل طے کرتی گئیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> مختلف تہذیبی عوامل، رنگا رنگی، قدرتی عناصر، مسلسل میل اور رسوم و معاشرت گھل مل کر رفتہ رفتہ صدیوں میں جا کر کسی زبان کے خدوخال اجاگر کرتے ہیں۔[۲۳]

اردو زبان کی ابتدا اور اس کی خاندانی پس منظر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کسی نے اردو کو سندھ کی پیداوار کہا ہے۔ کسی نے پنجاب کو اس کا اصل وطن قرار دیا ہے۔ کسی نے دکن تو کوئی اس پر قائم ہے کہ اردو گجرات میں پیدا ہوئی۔ بہت سے محققین نے اس زبان کے آغاز کو اکبر اور شاہ جہاں کے عہد سے منسلک کیا۔ مگر اس ساری بحث میں ایک قدر مشرک نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام لوگ اس پر راضی ہے کہ اردو زبان کی پیدائش برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی آمد سے ہوئی۔

اردو ایک ایسی زبان ہے جسے مسلمان افغانستان ،ایران اور عرب سے نہیں لائے نہ یہ زبان پہلے سے موجود تھی بلکہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی روبط اور تعلقات سے وجود میں آئی۔ تاریخ پر نظر دوڑانے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب مسلمان اس خطے میں وارد ہوئے تو یہاں نہ ایک زبان تھی نہ ایک حکومت بلکہ ہر علاقے کی اپنی حکومت تھی اور مختلف زبانوں کا رواج تھا مسلمانوں ہی کی وجہ سے حکومت بھی ایک بن گئی اور ایک زبان وجود میں آئی ۔جسے آج ہم ''اردو'' سے موسوم کرتے ہیں۔ عبارت بریلوی کہتے ہیں کہ :

> رفتہ رفتہ ایک ایسی مخلوط وجود میں آگئی جسے آج ہم اردو کہتے ہیں اور ماضی میں ہندی، ہندوی ہندوستانی، ریختہ، دہلوی، گجراتی وغیرہ کے ناموں سے پکاری گئی۔ اردو زبان دونوں قوموں (ہندو اور مسلم) کی شرکت اور اتحاد اور دونوں قوموں کی معاشرت و تہذیب کے میل کی ایک ایسی یادگار ہے جسے زمانہ کبھی بھلا نہیں سکتا۔[۲۴]

زمانہ قدیم میں ہر قسم کی گفتگو شاعری میں ہوتی تھی۔ یہاں تک جب نثر لکھی جاتی تھی تو وہ بھی شاعری کی طرح ہوتی تھی۔ تمام اقوام کی تاریخ کے اوراق اگر پلٹے جائے تو پتا چلتا ہے کہ شاعری سب سے پہلے وسیلہ گفتگو تھی ۔لوگوں کے مذہبی رسوم، شادی بیاہ، موت، خوشی غم کی تقریبیں اور کائنات کے بارے میں معلومات سب شاعری کے ذریعے ہوتی تھیں۔اس طرح اردو شاعری کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر شاعر نے اپنے دور اور اپنے عہد کو بیان کیا ہے اور خاص کر کے اپنے عہد کے تہذیبی اقدار اور روایات کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ بہت سے ناقدین نے اپنی تنقید میں اس بات کو موضوع بحث بنایا ہے کہ برصغیر پاک وہند کے شاعر کو اپنے خطے کے حالات واقعات کو سامنے لانا چاہیے۔ عرب اور ایران کے گیت گانے سے گریز کریں۔

شاعر ایک حساس قوم ہے۔ان میں عام آدمی کے نسبت محسوس کرنے کے حس زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تہذیبی رویوں کا بہتر اظہار نثر کی صورت نہیں بلکہ منظوم شکل میں زیادہ ہوا ہے۔ شاعر اور ادیب کو اپنے زمانے سے جدا نہیں کیا جاسکتا جہاں وہ رہتا ہے جہاں اس کا بچپن گزرا ہے۔اس کی مثال ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہے۔ چاہے وہ غالب ہے یا کوئی اور بڑا شاعر، انہوں نے اس وقت کے حالات بڑی مہارت سے قلم بند کیے۔اس کے علاوہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے حالات پیش کرنے میں اردو شاعروں نے اہم کردار ادا کیا ہے جیسے ناصر کاظمی۔ جب مارشل لا لگتا ہے تو فیض احمد فیض اور احمد فراز بچ نہیں سکے۔ تاریخ گواہ ہے شاعر اور ادیب نے خود کو اپنے دور کی تہذیب وثقافت اور روایات سے آشنا رکھا ہے۔ یونانی عہد سے لے کر موجودہ عہد تک ان سب نے اپنا اپنا فریضہ بخوبی سرانجام دیا ہے۔ مندرجہ ذیل میں ہندوستان کے اُن نظم گو شعر اور مصنفین کے نام درج ہیں جنہوں نے اس ضمن میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

قلی قطب شاہ، نظیر اکبر آآبادی، میر تقی میر، اسد اللہ غالب، آتش، اکبر الہ آبادی، سر سید احمد خان، الطاف حسن حالی، نذیر احمد، علامہ اقبال، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، ن۔ م راشد، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی اور اختر شیرانی وغیرہ۔ تصوف میں بابا فرید گنج شکر، خواجہ غلام فرید، سچل سرمست، خوشحال خان خٹک اور عبداللطیف بھٹائی وغیرہ۔

اس موضوع کے حوالے سے مندرجہ ذیل، میں کچھ نمائندہ نظم گو شعرا کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵ء تا ۱۸۳۰ء):

نظیر اکبر آبادی کا نام ایک علیحدہ دبستان کے طور پر لیا جاتا ہے۔۔ شیخ ولی محمد ان کا اصلی نام تھا۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ دہلی کی تباہی کا تھا۔ نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) نے عوام کو پریشان کر رکھا تھا اور اس تباہی کے بعد وہ

کسی اور تباہی کو برداشت کرنے کے حق میں نہ تھے۔ لوگ انتشار بھرے ماحول سے ہجرت کرنے لگے تھے ان میں نظیر کے والدین بھی شامل تھے جو آگرہ چلے گئے۔ بچپن میں نظیر مختلف کھیلوں، میلوں ٹھیلوں، تہواروں اور مقابلوں میں حصہ لینے لگے۔ اس لیے ناقدین نے نظیر کو عوام کا شاعر کہا ہے کیوں کہ وہ عوام میں بیٹھتے تھے اور جو دیکھتے وہ قلم بند کرتے تھے۔ نظیر کی نظمیں کسی خلا یا انسانی آبادی سے دور سانس نہیں لیتی بلکہ انہوں نے اپنی نظموں میں اپنے عہد ما حول اور اپنے معاشرت کے نقوش نقش کیے۔ اس لیے ان کے ہاں کوئی چیز فرضی یا تخیلی نہیں ہے۔ نظیر کی نظموں میں ہندوستان کے میلوں ٹھیلوں، توہمات و عقائد اور تہواروں کا ذکر زور شور سے موجود ہے۔

نظیر نے کسی کی مدح میں قصیدہ کہا نہ کسی کی برائی میں ہجو کہی بلکہ تہذیب و ثقافت کے تمام پہلو جو اس کے ارد گرد بکھرے تھے۔ اس پر اپنا زور قلم صرف کیا۔ انہوں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے لوگوں کے سماجی، تہذیبی عقائد، توہمات، رسومات، مشاغل، اور ان کی سوچ و بچار کو اپنی تخلیق کا موضوع بنایا۔ ان کی نظموں کے موضوعات میں حمد، نعت، شب برات، دوالی، عید الفطر، ہولی، جوگن، شہر آشوب اور روٹی نامہ وغیرہ شامل ہیں۔ ساتھ ساتھ مناظر فطرت کے بیان میں برسات کی بہاریں، جاڑے کی چاندنی، اور برسات کا تماشا کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

نظیر کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنا رشتہ کسی بیرون ملک کی تہذیب سے نہیں جوڑا بلکہ اپنی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا ہے۔ نظیر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہواروں اور رسم و رواج پر بہت لکھا ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ کہ

"نظیر ایک خالص ہندستانی شاعر تھے۔"[۲۵]

نظیر اکبر آبادی کا کلام اپنے دور کی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ ڈاکٹر کلیم الدین نے فرمایا ہے کہ ان کی شاعری ہندستانی فضا میں سانس لیتی ہے۔ وہ ہندستانی کلچر کے ایک نمائندہ اور عوامی تہذیب کے ایک جیتا جاگتا مرقع ہیں ۔انہوں نے اردو شاعری کے موضوعات میں تنوع پیدا کیا لیکن ان کی نظموں میں تفکر اور گہرائی کا فقدان بھی ملتا ہے لیکن ان کی نظموں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیوں کہ انہوں نے شاعری کو درباروں سے اٹھا کر عوام کی سطح پہ لایا۔ نظیر صرف عوام کا شاعر نہیں بلکہ انہوں نے اپنی تہذیب و تمدن کی دیوار کو مضبوطی سے تھاما ہے۔

عشق و محبت کے سلوک تہذیب کا ایک عنصر ہے۔ کسی خطے میں اگر انسان رہتے ہیں تو ان کی کاروبار زندگی کے لیے اہم چیز عشق و محبت ہے۔ محبت جیسا لطیف جذبہ اس زمین کے ہر زی رروح مخلوق میں موجود ہے۔ محبت صرف مرد اور عورت کے مابین نہیں ہوتی بلکہ محبت کی مختلف صورتیں ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ سے محبت، پیغبروں سے محبت اپنے رشتے داروں سے محبت وغیرہ۔ اگر انسان اپنی محبت میں ہر حد پار کرے اور دیوانگی کی حالت پہ پہنچ جائے تو یہ عشق ہے۔ جب انسان عشق کے درجے پر پہنچ جاتا ہے تو وہاں نفع و نقصان کی باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔

اس حوالے سے نظیر اکبر آبادی کا شعر ملاحظہ ہو۔

ادھر کو جس گھڑی اے ہم نشین وہ یاد آیا
ہمارے دل سے گئی بے کلی ، قرار آیا[۲۶]

نظیر اکبر آبادی نے رومانی طرز فکر پر بہت سی نظمیں تحریر کی ہیں۔ یہاں وہ اپنے محبوب کو اپنے دل کے سکون اور ٹھنڈک کی وجہ قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میرے محبوب وہ واحد ہستی ہے۔ جس کی یاد میرے قرار اور خوشی کی وجہ ہے۔

نظیر اکبر آبادی کو اہل بیعت سے بے پناہ محبت کرتے تھے وہ اپنی یادوں میں حضرت علیؑ کو بسانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی دنیاوی اور آخروی کامیابیوں کو حضرت علی سے منسوب کرتا ہے۔ اس حوالے سے نظیر اکبر آبادی کا شعر ملاحظہ ہو۔

علی کی یاد میں رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں
علی کی وصف کچھ کہنا سعادت اس کو کہتے ہیں
علی کی مدح کا پڑھنا کرامت اس کو کہتے ہیں
علی کے نام کا لینا حلاوت اس کو کہتے ہیں
علی کی حب میں مر جانا شہادت اس کو کہتے ہیں[۲۷]

نظیر اکبر آبادی کو صحابہ کرام اور نیک لوگوں سے دلی محبت ہے۔ وہ اپنی یادوں میں حضرت علیؑ کو بسانا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی شاعری اور باتوں کی مٹھاس کو اس وقت محسوس کرتا ہے۔ جب وہ حضرت علی کے کارناموں کا ذکر کریں۔ اس شعر میں اسلام کی راہ میں جہاد کو بتایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کے نام پر جتنی بھی باطل قوتیں ہیں ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر اسلام کی راہ میں شہید ہونا باعث فخر ہے اور میں اس کے لیے تیار ہوں۔

نظیر اکبر آبادی ہندوستان کا شاعر ہے۔ آپ نے ہندستانی عوام کے رسم و رواج اور مذہبی روایات کو بڑی جزئیات کے ساتھ بیان کیا۔ چھوٹے چھوٹے نکتے کو واضح کیا۔ عید جو ایک اسلامی تہوار ہے۔ نظیر نے اس موضوع پر کئی نظمیں لکھی۔ ان میں سے ایک نظم کا بند ملاحظہ ہو۔

پچھلے پہر سے اٹھ کے نہانے کی دھوم ہے
شیر و شکر سویاں پکانے کی دھوم ہے

پیر و جواں کو نعمتیں کھانے کی دھوم ہے
لڑکوں کو عید گاہ کے جانے کی دھوم ہے
ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل ہے اس عید کی خوشی[۲۸]

اس بند میں عید پر ہونے والے معاملات کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ یہ ایک رسم ہے کہ جب عید ہوتی ہے تو تمام لوگ اس موقع پر پاک صاف ہو کر عید گاہ جاتے ہیں اور یہ مبارک دن ہوتا ہے۔ میں غریب امیر، جوان و بوڑھے مختلف کھانے سیر کرتے ہیں۔ نظیر کے قریب اس عید کی خوشی تمام خوشیوں سے بڑھ کر ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے بہت سی نظمیں ایسی لکھی ہیں جس میں اس دنیائے فانی کو کوئی اہمیت نہیں اور یہ حقیقت بھی ہے۔ نظیر نے مشترکہ ہندوستان پر لکھی جن میں ہندو مسلمان شامل ہیں۔ اس بند میں اگرچہ دنیا اور آخرت کا تذکرہ ہے کہ ایک دن سب نے چلنا ہے کوئی یہاں ہمیشہ کے لیے نہیں آیا لیکن انہوں نے فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے فنکاروں مثال کے طور پر نقش گروں، مصوروں اور ادبا، شعرا کا ذکر بڑی مہارت سے کیا ہے کہ یہ لوگ اتنا عظیم مرتبہ رکھتے ہیں لیکن ایک نہ ایک دن ان کو بھی کوچ کر جانا ہے۔

کیا ہندو اور مسلماں، کیا رند و گبر و کافر
نقاش کیا، مصور، کیا خوشی نویس شاعر
جتنے نظیر یاں ہیں، اکدام کے ہیں مسافر
رہنا نہیں کسی کو، چلنا ہے سب کو آخر
دو چار دن کی خاطریاں گھر ہوا تو پھر کیا[۲۹]

نظیر اکبر آبادی نے تاریخ کے واقعات منظوم شکل میں پیش کیے ہیں۔ اس بند میں آپ نے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ بڑی سے بڑی بات کو کم الفاظ میں بیان کیا ہے۔

یا ہو حکیم حاذق، کرنے لگے طباعت
مردوں کے تیئں جلایا، عیسٰی کی کی کرامت
کھوئے مرض ہزاروں دھوئی ہر اک کی زحمت
جب آئی سر پہ اپنے، پھر کچھ چلی نہ حکمت
لقمان یا افلاطون آکر ہوا، تو پھر کیا[۳۰]

الطاف حسین حالی(۱۸۳۷تا۱۹۱۴):

مولانا الطاف حسین حالی کا شمار سر سید احمد خان کے رفقا اور دوستوں میں ہوتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے اردو نظم کی جو بنیاد کھڑی کی تھی۔ حالی نے اس پر ایک شان دار عمارت قائم کی۔ آپ نے قدیم شعرا کی طرح صرف گل و بلبل اور عشق و عشقی کے نغمے نہیں گائے بلکہ اپنے لیے ایک الگ راہ کا انتخاب کیا۔ انجمن پنجاب کے زیر اثر جدید طریقے پر جو مشاعرے ہو رہے تھے حالی نے اس میں اپنا کردار ادا کیا۔ نیچرل شاعری کو موضوع سخن بنایا۔ الطاف حسین حالی نے اس انجمن میں چار مثنویاں بھی لکھیں جو ملک کے کونے کونے میں مقبول ہوئیں۔

حالی کے عہد میں ملک بھر میں انگریزی اثرات کا پھیلاو ہر طرف تھا۔ مختلف تبدیلیاں ابھر رہی تھیں۔ نئے علم و فنون جنم لے رہے تھے۔ مگر مسلمانوں کا اس تبدیلی کا احساس نہ تھا۔ بعض لوگوں کو احساس تو تھا لیکن ان کو اپنے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ حالی ان سارے حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے اس لیے سر سید کی تحریک میں شامل ہو کر مسلمانوں کو وہ راستے دکھائے جن پر چل کر کامیابی ان کا مقدر بن سکتی تھی۔ حالی نے لوگوں کے سامنے تنزلی کے اسباب بھی سامنے رکھ دیے اور لوگوں کو امید کی راہ دکھائی۔

سر سید اور حالی نے مسلمانوں کی معاشی، تعلیمی، روحانی، تہذیبی، سماجی اور تمدنی اعتبار سے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں میں اپنی تہذیب و ثقافت، زبان اور مذہب کے حوالے سے شعور پیدا کیا۔ الطاف حسین حالی نے اپنی تنظیموں کے ذریعے ہندستانی سماج کی اصلاح کی۔ سر سید کی ایما پر مسدس مدو جزر اسلام لکھی تو دوسری طرف، مناجات بیوہ، اور چپ کی داد، لکھ کر ہندستان کو اپنا تہذیبی ورثہ دیا ان کی مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب کی خوب صورت تصاویر ملتی ہیں۔ اردو ادب حالی کی ان مثنویوں پہ نہ صرف فخر کریگا بلکہ آنے والی نسلیں ان میں اپنا تہذیبی سرمایہ دیکھے گی۔

حالی نے غزل نظم کے ساتھ تنقید کے میدان میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ بہت سی نظموں ایسی لکھی جن میں مسلمانوں کی عظیم تہذیب کو مد نظر رکھا۔ مسدس حالی(۱۸۷۹ء) آپ کی وہ طویل نظم ہے جس نے آپ کو شہرت عطا کی اس نظم میں مسلمانوں مذہبی زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قوم کا عبرنات نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس طویل نظم کے علاوہ حالی کی باقی نظموں میں تہذیب و ثقافت کے عناصر ملتے ہیں۔ اس حوالے سے حالی کے کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

جو مصروف ہے کشت کاری میں کوئی
تو مشغول دکانداری میں کوئی
عزیزوں کی ہے غم گساری میں کوئی
صعیفوں کی خدمت گزاری میں کوئی

یہ ہے اپنی راحت کے سامان کرتا
وہ کہنے پہ ہے جان قربان کرتا[۳۱]

حالی نے اس بند میں معاشرے کے اندر سماجی تعلقات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کہ ارد گرد تمام لوگ کھیتی باڑی میں لگے ہوئے ہیں کیوں کہ اگر وہ کام نہیں کریں گے تو دنیا کا نظام رک جائے گا۔ کوئی اپنے کاروبار میں مصروف ہے تو کوئی ایک دوسرے کے ساتھ دلجوئی اور خدمت میں لگے ہیں۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک معاشرے کے اندر سب اپنے اپنے فرائض اور اسلوبی سے نبھائیں گے تو خوشی اور راحت مقدر ہو گی۔

کہ ہے ذات واحد عبارت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق
اسی کے ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ[۳۲]

الطاف حسین حالی سے پہلے شاعری میں گل و بلبل اور ایک خیالی محبوب کے قصے کہانیاں بہت تھیں جبکہ حالی نے اپنا محبوب خدا کو بنایا ہے۔ وہ خدا سے محبت کی تاکید کرتا ہے اور اس کے علاوہ وہ کسی دوسرے کو محبت اور عبادت کے لائق نہیں سمجھتا۔

فنون لطیفہ جمالیاتی حس کے اظہار کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ فنون لطیفہ سے مراد جذبات کا اظہار ہے اور دل کو چھو لینے والی کسی تخلیق کا جنم لینا ہے۔ چاہے یہ کسی صورت میں۔ شاعری، مصوری مجسمہ سازی تصویر کشی تعمیرات، موسیقی تھیٹر، فلم اور رقص جیسے شعبوں کو فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہو۔

عرض فن ہیں جو مایہ دین و دولت
طبیعی، الہی، ریاضی، حکمت
طب اور کیمیا ہندسہ اور ہیت
سیاست ،تجارت، عمارت، فلاحت
لگاؤ گے کھوج ان کا ذکر جا کر جہاں تم
نشاں ان کے قدموں کے پاؤ گے واں تم[۳۳]

حالی نے اپنی شاعری میں نہ صرف مسلمانوں کی موجودہ تہذیب و ثقافت کو پیش کیا ہے بلکہ وہ بار بار مسلمانوں کے شاندار ماضی کو بھی بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ نئی نسل کو عظیم علم ریاضی، سائنسدادنوں، ماہر طبیب، عظیم سیاسی لوگوں، فنون لطیفہ کے ماہر کے کارناموں سے روشناس کرتے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا
کسی کا ہبل تھا، کسی کا صفا تھا
یہ غزا پہ وہ نائلے پر فدا تھا
اس طرح گھر گھر بنا اک خدا تھا
نہاں ابر ظلمت میں تھا مہر انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر[۳۴]

تاریخ تہذیب کا اہم عنصر ہے کیوں کہ اسی کے ذریعے قومیں آگے جا کر ترقی کی بلندیوں کو چھوتی ہیں اور تاریخ میں جو کچھ انسان کے مذہب اور ترقی کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے وہ اس کو ترک کرتا ہے۔ اس بند میں اسلام سے پہلے کا وہ منظر بیاں کیا ہے، جس میں ہر طرف مختلف بتوں کا رواج اور بول بالا تھا ہر کوئی بتوں کا پجاری اور عاشق تھا۔ اس بند میں مختلف بتوں کا ذکر کیا ہے جو تاریخ میں گزرے ہیں۔

جاہلیت کے زمانہ میں تھی یہ رسم عرب
کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگدل باپ اس گود سے لے کر ماں کی
گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر[۳۵]

اسلام کے ظہور سے پہلے لوگ غلط رسم رواج کو اپنائے ہوئے تھے بیٹی پیدا ہونے کو باعث عار سمجھا جاتا تھا اور اس کے بعد ہوتے ہی اسے زندہ دفنا دیا جاتا۔ یہ زمانہ جاہلیت کی بری رسم تھی۔ جسے حالی نے بیاں کیا ہے۔

علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ تا ۱۹۳۸):

انیسویں صدی کا آخری وقت برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اہم اور قیمتی ثابت ہوا کیوں کہ اس دوران مولانا حسرت موہانی اور قائد اعظم جیسی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں۔ سید سلیمان ندوی اور علامہ بشیر احمد ایسی شخصیات سامنے آئی جو ادیب عالم دین شاعر اور ملک کے لیے رہنما ثابت ہوئے۔ یہ وقت مسلمانوں کے لیے بڑا صبر آزما تھا۔ پر آشوب دور

تو(۱۷۰۷ء)اورنگزیب کی وفات سے شروع ہو چکا تھا۔ زیادہ تکلیف دہ شکل ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کی حکومت سے سامنے آئی۔ انگریز کے پاوں جیسے جیسے مضبوط ہو رہے تھے مسلمانوں پر سیاسی، سماجی ،اقتصادی اور علمی اعتبار سے زندگی تنگ ہوتی جارہی تھی۔ پہلے اردو کے چکر میں فارسی کو ختم کیااور بعد میں اردو کی بجائے انگریزی کو رواج دیا۔ انگریز کے ساتھ ہندووں کو مضبوط کرنے کے لیے اور مسلمانوں کی ثقافتی زندگی کو گرانے کے لیے اردو کی بجائے ہندی کو رواج دینا شروع کیا۔ ہندووں نے مختلف جماعتیں اور تحریکیں بنانی شروع کیں تاکہ مسلمان ہندو بن جائے یا ہندوستان چھوڑ کے چلے جائے۔ ۱۸۷۵ء میں دیانند سرسوتی نے آریا سماج کی بنیاد ڈالی۔ اس جماعت کا مقصد ہندووں کو طاقتور بنانا تھا۔ یہ تحریک مسلمانوں کے خلاف تھی۔ ۱۸۸۲ء میں دیانند سرسوتی نے گئور کھشا سبھا قائم کی اوور ہندووں کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا ۔اس دوران ایک بنگالی ہندو چندر چڑجی کا ناول "آنند مٹھ" سامنے آیا جس میں مسلمانوں کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں ہندووں نے ایک سیاسی جماعت بنائی جس کا نام "انڈین نیشنل کانگریس" تھا۔ یہ جماعت صرف ہندووں کے مفاد کے لیے تھی۔ تاریخ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں اور ہندووں نے مسلمانوں کو ہر لحاظ سے دبانے کی کوشش کی۔ ان تمام حالات نے نہ صرف عام مسلمانوں کو پریشان اور نڈھال کیا ادیب اور شاعر رہنمائے قوم بھی سوچنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے پیش نظر سرسید احمد خان نے ۱۸۷۰ء یہی بات کی کہ مسلمان اور ہندو ایک ساتھ نہیں رہے سکتے۔ سرسید نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا اس رسالے میں نہ صرف اردو زبان کے حوالے سے بات کی بلکہ مسلمانوں میں تہذیب اور شعور پیدا کرنے کے لیے مختلف مضامین لکھے۔

جہاں تک شاعری اور ادب کی بات ہے تو تہذیب الااخلاق سے سے اردو نثر میں تبدیلی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا حالی اور آزاد کی بدولت اردو شاعری میں ایک نیااور انوکھا رخ اختیار کر چکی تھی۔ نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر جیسے بڑے نام اس دور میں سامنے آئے۔ اکبر الہ آبادی نے ملک و قوم تو اپنی تہذیب کی حفاظت کرنا سکھایا۔ حالی نے مسدس مدو جزر اسلام لکھ کر ساری قوم کو بیدار کیا۔ وہی مسلمان جو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے اپنی تباہی دیکھ رہے تھے جو تعلیمی اور تہذیبی لحاظ سے شکستہ پا تھے، وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ملک و قوم کی ترقی میں ہاتھ پاوں مارنے لگے۔ یہی وہ تازہ دم فضا تھی جس میں اقبال پیدا ہوئے، پروان چڑھے اور آخر کار مسلمانوں کے لیے ایک اچھے رہنما بن کے ابھرے۔

اقبال نے سارے حالات کا مشاہدہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی بقا اپنی تہذیب کی پیروی میں ہے۔ آپ نے مغربی تہذیب اور تعلیم کو کھوکھلا قرار دیا۔ آپ نے مسلمانوں کو اپنی تہذیب، تعلیم اور مذہب کی طرف

راغب کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کو ان کی ثقافت سے روشناس کیا۔اقبال کی نظموں میں تہذیب و ثقافت کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

کسی کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
عمر بھر تیری محبت میری خدمت کر رہی
میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی[۳۶]

اقبال نے سماج میں موجود ہر رشتے اور تعلق کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ وہ حال اور مستقبل کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ یہ اشعار اقبال نے اس وقت لکھے جب ان کی والدہ فوت ہوئیں۔اقبال کی ماں نے ان کی ایسی پرورش کی کہ وہ دنیائے عالم میں ہر دور اور عہد کے لیے ایک مثالی نمونہ بن گئے، لیکن اقبال اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ جب وہ ماں کی خدمت کا قابل ہوا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق[۳۷]

اقبال کی نظموں میں عشق جیسے جذبے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اس شعر میں عظیم الشان پیغمبروں کے کارناموں کو مختصر الفاظ میں بیاں کیا ہے۔ابراہیمؑ اور حسین جیسی وہ عظیم ہستیاں ہیں جنہوں نے خدا سے عشق کرنے میں انتہا کی حدود کو چھوا تھا۔ یہاں پر خاص کر ان غزوات (بدر و حنین) کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی۔ غزوہ بدر نے ساری دنیا کو ثابت کر دیا اگر مسلمانوں کے دلوں میں یقین اور ایمان کی دولت ہو تو جیت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ غزوہ حنین کی بھی مسلمانوں اور آپ کی خدا سے عشق کا ثبوت ہے۔ غزوہ حنین جزیرہ عرب میں بت پرستی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔

وہ میرا یوسف ثانی ، وہ شمع محفل عشق
ہوتی ہے جس کی اخوت قرار جان مجھ کو[۳۸]

اقبال کی نظموں میں عشق کے جذبے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ شعر اپنے محترم بھائی شیخ عطا محمد کی محبت میں لکھا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو دوسرا یوسف کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے بھائی کو عشق کی محفل کا چراغ قرار دیتا ہے کہ آپ کی محبت نے مجھے سکون ہی سکون بخشا ہے۔

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوہ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں[39]

اقبال کی نظمیں تاریخ کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ وہ آنے والی نسلوں کو ترقی کی راہ پر لانے اور مہذب بنانے کے لیے تاریخ کی ان شخصیات اور واقعات کا سہارا لیتا ہے۔ جن کے نام ہر زمانے میں زندہ ہیں۔ اقبال نے اس شعر میں موسیٰؑ کے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس کو خدا سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ اسے دیکھنے کوہ طور پر پہنچا۔ لیکن افسوس کہ آج کے مسلمان کے سامنے خدا اور اس کی نعمتیں درکار ہیں۔ لیکن ان میں موسیٰؑ کی طرح کوئی نہیں نہ کسی میں اس جیسا جذبہ رہا ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر وتیشہ وسنگ گراں ہے زندگی[40]

اقبال کی نظمیں تاریخ کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ تلمیح کا سہارا لے کر اقبال نے زندگی کی حقیقت کو انسانوں پر اشکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کے متعلق فرہاد سے پوچھو وہ آپ کو بتادے گا کہ دودھ کی نہر، تیشہ اور بھاری پتھر کا دوسرا نام زندگی ہے۔ یعنی جو لوگ دنیا میں نمایاں کارنامے سرانجام دیتے ہیں ان کارناموں کے باعث ان کا نام زندہ ہوتا ہے۔ ہمت نہ ہارنا بھی زندگی ہے۔

شعر سے روشن ہے جان جبرئیل واہرمن
رقص و موسیقی سے ہے سوزوسرور انجمن[41]

اقبال فنون لطیفہ کو ملک و قوم کی ترقی کے لیے اہم سمجھتے ہیں شعر ادب کا وہ حصہ ہے جس حضرت جبریل اور شیطان دونوں کی جان روشن ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے نیک اور بد دونوں کام لیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ناچنے اور گانے سے محفل میں خوشی کا سماں بندھتا ہے۔ چین کے ایک فلسفی نے فن کے راز اس طرح فاش کیے ہیں کہ شاعری گانے کی روح ہے اور رقص گانے کا بدن۔

مجموعی جائزہ:

ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہوتا ہے۔ تہذیب کا وجود زمانہ قدیم سے دور جدید تک سفر کرتا آگیا۔ جنگلی انسان سے لے کر آج کے مشینی انسان تک یہ سفر مختلف تبدیلیوں سے گزر کر ایک سیلاب کی طرح بہتا گیا۔ تہذیب کے اس سیلاب سے کوئی شاعر یا ادیب بچ نہیں سکا کیوں کہ شاعر وہ دیدہ بینا قوم ہے، جو بہت

تیزی سے خارج سے اثر لیتا ہے۔ ہر عہد کے شاعر نے خود کو اپنے ارد گرد کے حالات سے باخبر رکھا اور انھیں حالات کے واقعات کو صفحات میں قلم بند کیا۔ عالمی سطح پر ٹینی سن، ملٹن، سارتر اور میکسم گورگی جیسے ادیب ہو یا نظیر، سرسید احمد خان، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض جیسے بڑی تخلیقی شخصیات ہو سب نے اپنے تہذیبی اثرت کو قبول کر کے کتابوں میں دفن کیا۔ اُردو ادب کے البم میں دور جدید اور دور قدیم کے شعرا نے اپنی نظموں کے حسین تصاویر رکھ دیئے ہے جن کو اکٹھا کر کے ہر عہد کی تہذیب و ثقافت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ نظیر، اقبال اور حالی کے بعد اور بھی نظم گو شعرا آئے جنہوں نے اردو نظم میں تہذیبی عناصر کے خوبصورت رنگ بکھیر دیے۔ ان میں جوش ملیح آبادی، ناصر کاظمی، اختر شیرانی، منیر نیازی، افتخار جالب، احمد ندیم قاسمی، ن-م راشد میراجی وغیرہ اہم نام ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خواجہ عبدالمجید (مرتب) مصباح اللغات (لاہور: جامع اللغات کمپنی، س ن)، ص ۲۴۴۔

۲۔ محمد راشد بھٹی، مطالعہ تہذیب اسلامی (دوسرا ایڈیشن) (لاہور: اردو بازار، ۱۹۶۹ء) ۲۰۔

۳۔ سبط حسن، ماضی کے مزار (کراچی: مکتبہ دانیال ۱۹۹۶ء)، ص ۲۴۔

۴۔ محمد احمد علی (مترجم) تاریخ تمدن (دوسرا ایڈیشن) (لکھنو: الناظر پریس، ۱۹۱۷ء)، ص ۸۔

۵۔ غلام جیلانی برق، ہماری عظیم تہذیب (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز ۱۹۷۱ء)، ص ۱۹۔

۶۔ ولیم بینٹن، *انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا* (جلد پنجم) (لندن: ۱۹۶۵ء)، ص ۸۳۱۔

۷۔ جمال الدین، محمد بن مکرم ابن منظور افریقی المصری، لسان العرب اجلد التاسع بیروت دار صادر، س ن)، ص ۱۹۔

۸۔ ایڈیٹوریل (Editorial)، *The Culture Policy*، (لاہور: The nation) بتاریخ ۱۳ اگست ۱۹۹۵ء۔

۹۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، (کراچی: کتب پرنٹرز و پبلشرز ۱۹۷۵ء)، ص ۴۳۔

۱۰۔ سبط حسن، ماضی کے مزار، ص ۲۳۔

۱۱۔ سر سید احمد خان، مقالات سر سید (جلد ششم) (لاہور: ۱۹۶۲)، ص ۳۔

۱۲۔ غلام جیلانی برق، ہماری عظیم تہذیب، ص ۲۰۔

۱۳۔ الحاج مولوی فیروز الدین (مرتب) فیروز اللغات اردو (لاہور: ظہیر اسلام پرنٹرز و پبلشرز، س ن)، ص ۸۵۳۔

۱۴۔ صحیح بخاری، برقم (۲۰۱۱)، صحیح و مسلم: (۲۵۸۶)۔

۱۵۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، ص ۴۰۔

۱۶۔ الحاج مولوی فیروز الدین (مرتب) فیروز اللغات اردو، ص ۹۴۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۶۰۔

۱۸۔ یوسف مثالی (مرتب) شرح کلیات اقبال (لاہور: تایا پرنٹرز، ۲۰۱۷)، ص ۵۸۳۔

۱۹۔ الحاج مولوی فیروز الدین (مرتب) فیروز اللغات اردو، ص ۷۵۱۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۶۰۔

۲۱۔ ولیم بینٹن(William Benton، *The new Encyclopediia Britannica in vol.30 micropedia vol .5 (1943-1973)*، ص ۶۴۔

۲۲۔ الحاج مولوی فیروزالدین(مرتب) فیروز اللغات اردو، ص ۹۹۵۔

۲۳۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد اول)(لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء)، ص ۸۵۔

۲۴۔ عبادت بریلوی(مرتب)خطبات عبدالحق بحوالہ ہندی اردو تنازعہ از فرمان فتح پوری (نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۷ء)، ص ۶۵۔

۲۵۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو (لاہور:۔پرنٹ یارڈ پرنٹرز، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۱۶۔

۲۶۔ ڈاکٹر محمد افتخار شفیع، اصناف شاعری (لاہور: عمر، عثمان، شفیق پرنٹرز ۲۰۱۸ء)، ص ۹۳۔

۲۷۔ باصر سلطان کاظمی(مرتب)انتخاب نظیر ناصر کا ظمی(لاہور: جہانگیر بک ڈپو، ۲۰۰۳ء)، ص ۸۸۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۰۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۶۰۔

۳۰۔ رانا حضر سلطان(مرتب) کلیات نظیر اکبر آبادی (لاہور: پرنٹ یارڈ پرنٹرز ۲۰۰۷ء)، ص ۱۴۷۔

۳۱۔ الطاف حسین حالی، مسدس حالی (لاہور: پرنٹ یارڈ پرنٹرز ۲۰۱۶ء)، ص ۱۳۳۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۶۴۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۴۲۔

۳۵۔ خواجہ الطاف حسین حالی، کلیات حالی (دہلی: پیام وطن پریس، ۱۹۶۰ء)، ص ۲۰۔

۳۶۔ یوسف مثالی(مرتب)شرح کلیات اقبال (لاہور:۔پرنٹ یارڈ پرنٹرز، ۲۰۱۸ء)، ص ۴۳۲۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۵۵۷۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۴۸۷۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۰۴۹۔

باب دوم:

اختر شیرانی کی نظموں میں سماجی تعلقات اور عشق و محبت کے سلوک کی عکاسی

اختر شیرانی ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو ریاست ٹونک کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اصل نام داود خان تھا ۔آپ اردو ادب کے بڑے عالم اور معروف محقق حافظ محمود شیرانی کے بیٹے تھے۔ محمود شیرانی ایک بڑے محقق کے طور پر ابھرے جبکہ اختر شیرانی کا اردو ادب میں بطور رومانی نظم گو کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

بچپن کو دیکھا جائے تو اختر کی پرورش مختلف طریقے سے ہوئی۔ انھیں بارہ سال تک گھر سے باہر نہ جانے دیا۔ ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ قرآن پاک کی تعلیم کے ساتھ اردو کی کتابیں گھر میں پڑھیں اور ساتھ فارسی کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ فارسی میں اختر کے استاد صابر علی صاحب شاکر تھے۔ انہی کی محبت میں طبعیت شاعری کی طرف مائل ہوئی۔ شاعری میں شاکر سے اصلاح لیتے رہے۔ شاکر کے علاوہ منشی احمد خان کے کتب خانہ ،،صاحبزادہ عبدالرحیم اور منشی یوسف خان سے بھی شاعری کا درس لیا۔ اختر نے بچپن سے شاعری کا آغاز کیا۔ کیوں کہ گھر سے ان کو ایسا ماحول ملا جن سے ان کی شاعری میں وقت کے ساتھ نکھار آتا گیا۔

اختر ایک عاشق پرست انسان تھے۔ لڑکپن سے مزاج میں عاشقی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں اختر ٹونک کو چھوڑ کے لاہور پہنچے۔ اس وقت اختر کی عمر ۱۴ سال تھی۔ لاہور میں آنا آپ کی ادبی زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اختر شیرانی کا اردو ادب میں بطور رومانی نظم گو کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ آپ نے اپنی رومانی نظموں میں اپنی محبوباوں کے نام کھلم کھلا لیے ہیں۔ جن میں سلمی ،ریحانہ، عذرا، زہرہ، پروین، نسرین، زلیخا، ناہید،، ثریا اور لیلیٰ وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام محبوباؤں کے تصورات اختر کی منظوم داستانوں کی زینت بنی۔ اکثر ناقدین کا خیال یہ ہے کہ اختر نے اپنی محبوباوں کو فرضی ناموں سے پکارا۔

اختر کی ایک دو عادات ایسی تھیں جن کی وجہ سے والد صاحب اکثر اختر سے خفا رہتے تھے۔ ان میں ایک عادات شراب نوشی تھی۔ کئی دفعہ چھوڑنے کی کوشش کی مگر چھوڑ نہیں پائے۔ لاہور میں رہنے کے بعد بھی ٹونک آتے جاتے تھے۔ اس عرصے میں بھی مے نوشی سے جان نہیں چھوٹی۔ اختر ایک انسان دوست اور سادہ مزاج انسان تھے۔ محمود شیرانی کی وفات کے بعد خواب غفلت سے بیدار ہوئے لیکن پھر بھی شراب نوشی کی عادات نہ چھوڑی۔ کئی اشعار میں شراب نوشی کا ذکر کیا۔ اس خراب لت کی وجہ سے طبعیت رفتہ رفتہ بگڑتی گئی۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اختر شیرانی انتقال کر گئے۔

اختر ایک رومان پسند، لاپرواہ اور اس دنیا سے بے خبر آدمی تھے۔ ایسے لوگ سماجی رسم ورواج اور کسی پابندی کے زیر اثر نہیں رہے سکتے لیکن آپ نے اپنے معاشرے کے بہت سی روایات کو احترام کی نظر سے دیکھا اور ان روایات کو نبھایا بھی۔ قدیم مشرقی روایات کو پسند کیا۔ والد صاحب سے اختلاف کے باوجود ان کو عزت واحترام دیا۔ اساتذہ اور دوسرے لوگوں کا خیال رکھا۔ مغربی اقدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ عورت ان کی شاعری کا ایک اہم حوالہ ہے۔ یہ عورت صرف اختر کی محبوبہ نہیں بلکہ ماں، بہن اور بیوی بھی ہے۔ اختر شیرانی نے عورت کو اس کائنات کا عظیم ترین مخلوق کہا ہے۔ اس کی خوشی میں شریک ہوئے اور اس کی تکلیف میں آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔

اختر ایک مذہبی انسان بھی تھے۔ آپ نے مذہبی موضوعات پر بہت سی نظمیں بھی لکھیں۔ اپنے معاشرے کی بہت سی رسموں اور رواجوں کو خوبصورت الفاظ میں بیاں کیا۔ پیٹر ویسٹ لینڈ کے خیال میں عظیم رومان پسند حقیقت پسند بھی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر یونس حسنی نے انگریزی شاعر بائرن کے بارے میں اپنی کتاب ،اختر شیرانی اور جدید اردو ادب میں لکھا ہے کہ:

> بائرن نے بھی رومانی داخلیت اور دل کی دنیا کو بالائے طاق رکھ کر خارجی اور سماجی معالات کی طرف توجہ دی۔[1]

یونس حسنی کے اس قول سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ جو تخلیق کار رومانی نغمے الاپ سکتا ہے۔ وہ سماج کی طرف نظر نہیں دوڑا سکتا بلکہ ہر رومان پسند اپنے خارجی معاملات کو ہر گز نظر انداز نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اگر وہ کچھ وقت کے لیے تخیل اور رومان کے آغوش میں جائے تو خارجی حالات اسے جگا دیتے ہیں۔

اختر شیرانی کی نظم ونثر میں لکھے گئے کلام کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ شاعری میں ان کی تصانیف کے نام درجہ ذیل ہیں۔

پھولوں کے گیت(۱۹۳۶ء) نغمہ حرم(۱۹۳۹ء)

صبح بہار(۱۹۴۵ء) اخترستان(۱۹۴۶ء)

لالہ طور(۱۹۴۷ء) طیور آوارہ(۱۹۴۶ء)

شہناز(۱۹۴۸ء) شہرود(۱۹۴۹ء)

شعرستان(۱۹۴۱ء)

جب کہ نثر میں درجہ ذیل تصانیف ہیں۔

ضحاک(۱۹۲۹ء)　　ڈھر کے دل(۱۹۴۶ء)

آئینہ خانے میں(۱۹۳۶ء)　جوامع الحکایات والواصع الروایات(۱۹۴۳ء)

اختر و سلمیٰ کے خطوط(۱۹۵۷ء)

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھا(۱۹۴۷ء)

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ اختر نے اردو ادب میں بھی نمایاں اضافے کیے۔خواجہ عبدالمجید کی جامع اللغات کی ترتیب میں ان کی مدد کی۔پروفیسر شیخ محمد اقبال نے جن نصابی کتب کو مرتب کیا اختر نے ان کی معاونت کی۔اس کے علاوہ مختلف رسائل واخبارات میں اپنے مضامین شائع کیے۔کچھ ماہ ناموں کے مدیر بھی رہے۔کئی اخباروں میں کالم لکھے۔شاعری کے علاوہ اختر کی نثری خدمات قابل ذکر ہیں۔تحقیق و تنقید،طنز و مزاح،افسانہ نگاری اور انشا پردازی ہر موضوع کو قلم کی زد میں لایا اور اردو ادب کے ہر میدان میں اچھے رنگ بکھیرے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اردو ادب میں رومانی رنگ وواضح طور پر ابھرنے لگا۔اختر وہ رومانی شاعر ہے جنہوں نے رومانیت کو اپنی نظموں میں سمویا اور ایسے منفرد انداز میں رومانی نغمے گائے کہ یہ اعزاز کئی دوسرے شاعروں کے حصے میں نہ آیا۔ڈاکٹر محمد حسن نے اختر کے بارے میں فرمایا کہ اختر ایک رومانی شاعر ہیں یا کچھ بھی نہیں۔لیکن محمد حسن کے اس قول کے باوجود اختر شیرانی کی رومانوی نظموں کے دوسرے پہلو کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اختر نے نہ صرف انگریزی رومانیت کا اثر لیا بلکہ فارسی و عربی سے بھی نہ بچ سکے اور اس طرح عربی و فارسی کی عشقیہ خصوصیات اور ان کے عہد کے سماجی حالات کو بھی قبول کیا۔یہاں اختر کی شاعری ایک نیا رنگ لے آتی ہے۔جس میں مشرق و مغرب کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔آپ کی زندگی میں وہ تمام اچھائیاں اور خامیاں دیکھائی دیتی ہیں جو ایک ایک رومانی فنکار کے لیے ضروری ہیں وہی بے اصولی،،لاابالی،تصور پرستی اور جذباتیت جو دوسرے رومانی فنکاروں کا خاصہ ہے۔وہ سب اختر میں رچ بس گئی ہیں۔اختر اپنی رومانی نظموں میں بائرن،ورڈزورتھ،بودلیئر اور امراوالقیس کی پیروی کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں مگر اس رومانی شاعری میں تہذیب کا دامن بھی پکڑے رکھتے ہیں۔

اختر شیرانی نے اپنی نظموں میں تہذیب و ثقافت کے عناصر،جیسے سماجی تعلقات،عشق و محبت،رسم رواج ،تاریخ،فنون لطیفہ شعر ادب کو پورے انصاف کے ساتھ بیان کیا۔آپ نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو بیان کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔

ا۔ سماج اور سماجی تعلقات:

انسان کا جسم مختلف اعضا سے مل کر بنا ہے۔ اگر یہ تمام عضو انسانی صحت منداور مضبوط ہوں تو ایسے میں انسان اپنے کام کاج احسن طریقے سے سرانجام دیتا رہے گا۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماج میں ایک الگ فرد گزر بسر نہیں کرتا بلکہ یہ متعدد افراد کا مجموعہ ہے۔ اگر ہر فرد اپنی زمہ داری کو پورا کرے گا اور سماج کے افراد کی صلاحیتں قابل ذکر ہوں گی تو سماجی معیار بلند ہو گا۔ کوئی بھی کامیاب سلطنت اچھے اور منظم سماج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سلطنت کی ترقی کا دارومدار اچھے اور صحت مند سماج پر ہے۔ احمد ایس ٹیپل اور غلام ابرابر صدیقی کے بقول:

> سلطنت کو مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے سماج کے افراد کی جسمانی اور دماغی ترقی کی ضرورت ہو گی۔[۲]

جہاں افراد جسمانی اور ذہنی طور مکمل ہوں گے اس معاشرے کی بدولت سلطنت پائیدار ہو گی۔ کیوں کہ ایک ملک میں متعدد سماج ہوتے ہیں اور جب سب جسمانی ذہنی اور مالی آسودگی سے مالامال ہو گے۔ اس سلطنت کو کبھی زوال نہیں آئے گا کیوں کہ ملک کی عزت اور بقا صرف حکمران طبقے کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ ملک و قوم کے عوام اس ضمن میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اگر اس کائنات کو بغور دیکھا جائے تو یہ بات انسان پر عیاں ہوتی ہے کہ زندگی میں قدم قدم پہ ایسے مراحل بھی آتے ہیں جہاں انسان جانوروں پر بھروسہ کرتا ہے اور وہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نہ صرف انسان مل جل کر سماج کو ایک خاندان کی شکل دیتے ہیں بلکہ جانور بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ معاشرے کے افراد کو چاہیے کہ انسانوں کے ساتھ جانوروں پر بھی یقین رکھے اور جس طرح ایک معاشرے کے افراد آپس میں تعلقات رکھتے ہیں اس طرح بے زبان جانوروں کے ساتھ بھی رحم دلی سے پیش آئے۔

اللہ تعالیٰ انسانی خدمت کے لیے بہت سے جانور پیدا کیے ہیں مثال کے طور پر چیونٹی دیکھنے میں نظر نہیں آتی مگر وہ ہر وقت انسان کی خدمت میں مصروف رہتی ہے۔ جب روٹی چاول کے ٹکڑے زمین پر گر جائے یا چھوٹے بچے شکر کو زمیں پہ گرائے تو ساری چیونٹیاں مل کر اس کی صفائی کرتی ہیں۔ شہد کی مکھیاں بڑی محنت سے شہد بناتی ہیں۔ اونٹ گھوڑے ہاتھی وغیرہ پر مسافر سفر کرتے ہیں اور سامان کی منتقلی میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ گائے بھنسیں اور بکریوں کا دودھ اور گوشت ہم انسانوں کے کام آتا ہے۔ اور بھی بہت سے جانور ایسے ہیں جو انسان کے کام آتے ہیں اور انسانوں کے ساتھ مل کر سماج کو مضبوط بناتے ہیں۔

یہ دنیا عظیم لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ جیسے عظیم ترین دانش وار، سیاست دان، ماہر طبیب، مدبر وغیرہ مگر یہ شخصیات ایسا دعوی کبھی نہیں کر سکتے کہ جن بلندیوں تک وہ پہنچے ہیں وہ صرف ان افراد کے انفرادی کارنامے ہیں بلکہ عام انسانوں کو درجہ کمال تک پہنچانے اور عظیم ترین انسان کی صف میں کھڑا کرنے والا صرف سماج یہی ہے۔

عبدالقادر عمادی اپنی کتاب سماج اور تعلیم میں رقم طراز ہیں۔

> انسان نے موجود تمدن کے پیدا کرنے میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا ہے۔ یہ حصہ مثبت بھی ہو سکتا ہے منفی بھی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان سماج میں رہنے پر مجبور ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک بچے کے پیدا ہوتے ہی اسے انسانی سماج یعنی اس کے خاندان سے ہٹا کر جنگل یا میدان میں ڈال دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی موت لازمی ہے۔ اس دنیا میں مطابقت پیدا کرنے اور زندگی کو ممکن بنانے کے لیے بچے کو کئی برس تک دیگر افراد کے سہارے اور مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کو سماجی ضرورت کہا جاتا ہے۔[۳]

سماج انسان کو زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے پر انحصار کر کے اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بناتے ہیں۔۔ سماج کو ایک تنظیم اور جماعت بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اس کے تحت تمام افراد ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔

ہر زبان کے ادب میں ادبا اور شعرا نے اپنے عہد کی عکاسی کی۔ جس عہد میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے اس میں معاشرے کی تصویر کشی ملتی ہے۔ ادب میں افراد کے جذبات اور معاشرے کے سماجی تعلقات اور رسم و راج کی عکاسی ہوتی ہے۔ شاعر کا تعلق ایک حساس طبقے سے ہوتا ہے۔ جس میں محسوس کرنے کا مادہ کثیر تعداد میں ہوتا ہے۔ وہ ہر بات کو محسوس کر کے ایسے الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ جیسے کولرج شاعر کے لیے دو چیزیں لازمی قرار دیتا ہے۔ایک وہبی صلاحیت دوسرا کسبی صلاحیت۔ وہبی صلاحیت کے تحت مختلف خیالات اس کے ذہن میں منتشر حالت میں ہوتے ہیں جبکہ کسبی صلاحیت میں وہ ان خیالات کو خارج سے کچھ الفاظ تلاش کر کے اسے اچھے اور مکمل شکل میں قاری کے سامنے لاتا ہے۔ سماج میں کوئی چیز بد نما نظر آتی ہو شاعر یا ادیب الفاظ کے ذریعے اسے حسین بنا کر پیش کرتا ہے۔اس سلسلے میں عبادت بریلوی اپنی کتاب تنقیدی زاویے میں رقم طراز ہیں کہ

> ادب ایک ایسا مقام ہے جہاں فنکار کی صناعی بد صورت چیز کو بھی حسن کے زیور سے آراستہ، پیراستہ کر کے پیش کر سکتی ہے۔اس اعتبار سے ادب کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے کیوں کہ ہماری سماجی زندگی میں کوئی میں اور مقام ایسا نہیں آسکتا، جہاں بد صورت چیز کو بھی حسین بنا کر پیش کیا جا سکے۔ یہ شرف صرف فنون لطیفہ اور ادب کو ہی حاصل ہے۔[۴]

عبادت بریلوی کے خیال میں فنکار اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے اور اپنے عہد سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ وہ جہاں رہتا ہے جس زمین پہ سانس لیتا ہے وہ اس کا اظہار فنکارانہ طریقے سے کرے گا۔

> میرے خیال میں ادب ایک سماجی فعل ہے۔ اور چوں کہ سماجی زندگی ہر لمحہ اور ہر آن تغیر و تبدل سے ہم آغوش و ہم کنار رہتی ہے۔ اس لیے ادب اور تغیرات و انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ ہر دور کے ادب میں ایسا وقت کی سماجی زندگی کی تصویروں کا نظر آنا ضروری ہے کیوں کہ ادب بہر حال سماجی زندگی ہی کے درمیان پیدا ہو کے پلتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔[5]

اختر شیرانی کی نظموں میں سماجی تعلقات کی عکاسی:

شاعری تہذیب کے سایہ میں سفر کرتی ہے۔ شاعری کسی بھی علاقے کے رسم و رواج، سماجی تعلقات، تاریخ عشق و محبت اور فکر و شخصیات کو قبول کرتی ہے۔ اس ضمن میں اردو ادب کے شعرا نے اپنی نظموں میں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اپنے مسلم معاشرے کے سماجی تعلقات کو ایک نئے اور اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جو سماجی اقدار ہوتے ہیں وہ کسی قانون کے نافذ کردہ نہیں ہے بلکہ ان اقدار کے پیچھے تاریخ روایات کی ایک لڑی دکھائی دیتی ہے۔ معاشرے کے تجربات اور مشاہدات اس کے پیچھے کی شان ہوتے ہیں۔ معاشرے میں موجود افراد اپنے سماجی اقدار پہ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ معاشرہ اس لیے اپنی اقدار کی پابندی کرتا ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے سماج کا بقا ممکن ہے۔ اگر ان اقدار کے معاملے میں سستی بھرتی جائے تو معاشرہ تہس نہس ہو جاتا ہے۔

ہر معاشرے کی بعض قدریں کسی دوسرے معاشرے سے مختلف ہوتی ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس میں ایک دوسرے کی تقلید کی جائے مثال ک طور پر کسی ایک خطے میں ایک شخص دو شادیاں کرتا ہے تو اسے برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ بعضوں میں اس کی ممانعت نہیں ہوتی۔ بعض میں طلاق کا کوئی تصور نہیں جب کہیں پر ہے۔ اسی طرح کچھ علاقوں میں چپکلی، مینڈک، کتے، سور اور سانپ کے گوشت کو کھایا جاتا ہے اور کچھ علاقوں میں اس کو کھانا حرام ہے بلکہ ایسے جانوروں کو کوئی چھوتا بھی نہیں۔

معاشرے کے سماجی اقدار ایک جگہ پر ساکت نہیں ہوتے بلکہ اس میں وقت کے ساتھ ردوبدل آتا ہے۔ عام آدمی کے بہ نسبت اہل فکر اور دانش در طبقہ اس کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ان حالات سے اثر بھی جلد لیتے ہیں۔ شاعر قوم اپنے ارد گرد حالات کا باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اسے الفاظ کا لباس عطا کرتا ہے اختر شیرانی کا کلام ملاحظہ ہو۔

شریف استاد کیسے مہربان ہیں
شفیق ایسے زمانے میں کہاں ہیں
محبت سے پڑھاتے ہیں ہر اک کو
جو کچھ بھولے بتاتے ہیں ہر ایک کو
ہمارا باغ اور میدا ن اچھا
ہمارے کھیل کا سامان اچھا
ہیں لڑکے باہم الفت کرنے والے
اور استادوں کی عزت کرنے والے
سب استادوں کا کہنا ماننے والے
اور ان کا مرتبہ پہچانتے ہیں۔[6]

اختر مدرسے کی ایک تصویر کھینچتے ہیں جس میں ایک قابل عزت استاد اپنے فرائض نبھا رہے ہیں۔ استاد اپنے شاگردوں کو ایک اچھا مستقبل اور حال سے روشناس کر رہے ہیں۔ یہی شاگرد اپنے ملک و قوم کے لیے کسی مشعل سے کم نہیں۔ معاشرے میں استاد اور شاگرد کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے کیوں کہ ایک خاندان کے اندر ماں باپ بچے کو اس دنیا میں لاتے ہیں جبکہ استاد اس کو زمانے اونچ نیچ اور اچھا اور برا سکھاتا ہے۔ اس طرح استاد معاشرے کے لیے ایک مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ وہ جو بھی محنت و مشقت کرتا ہے وہ بھی رائیگا نہیں جاتی بلکہ اس سے سماج میں ایک صحت مند تبدیلی آتی ہے۔

غلام حیدر نے استاد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

> میرے خیال میں کوئی اچھا استاد صرف چند لفظ ہی نہیں سکھاتا بلکہ اپنے شاگردوں کے کردار، دماغ طبیعت بلکہ پوری زندگی کو ایک شکل دینے کا اہم اور عظیم کام انجام دیتا ہے۔[7]

اختر شیرانی نے استاد اور شاگرد کو موضوع بنایا مگر انہوں نے اس طرح واضح اشارہ کیا ہے کہ کس طرح ایک شاگرد مثبت کردار ادا کر کے ایک مضبوط سماج کی بنیاد رکھتا ہے۔

نوید رحمت پروردگار بن کے رہو!
برنگ سایہ نخل چنار بن کے رہو!
تم اپنے گھر کے چمن میں بہار بن کے رہو!

بہشت نو کی فضائیں تمہیں مبارک ہوں!
مسرتوں کی گھٹائیں تمہیں مبارک ہوں !
نسیم گل کی طرح مشکبار بن کے رہو! [۸]

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ اختر شیرانی کو اپنی مشرقی اقدار اور تہذیب و ثقافت سے بہت محبت ہے۔ اپنی ایک رشتہ دار خاتوں کی شادی پر اسے دعا دی ہے۔ یہاں سماجی تعلق کا ایک مضبوط حوالہ دیکھائی دیتا ہے۔ نخل چنار کے استعارے میں اختر شیرانی نے عورت کا ایک خاندان سے تعلق کا ایک مضبوط حوالہ دیا ہے۔ عورت ایک نئے گھر میں جا کر پورے نظام کو تشکیل دیتی ہے۔

میاں بیوی معاشرے کے دو اہم کردار ہیں۔ ان کی مثال ایک ایسے ستون کی طرح ہے جس پر ہر معاشرہ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ دونوں جب شادی کی زنجیر میں بندھ جائے اور اس خوب صورت رشتے کو نبھانے کی کوشش کریں۔ تو یہ تا حیات ایک دوسرے کے فادار اور معاشرے کی ترقی کا باعث بنیں گے کیوں کہ ایک عورت کئی نسلوں کو سنوارتی ہے۔ جب ان دونوں فریقین میں کوئی بھی دور جائے تو غم اور تکلیف کے سائے مقدر بن جاتی ہے۔ اختر کی ایک نظم ''شوہر کے تابوت پر'' میں عورت اپنے شوہر کو یاد کرتی ہے اور اپنی تکلیف اور دکھ کو بیان کر رہی ہے۔ اس حوالے سے اختر شیرانی کلام ملاحظہ ہو۔

خاک میں چھپ جائے گی صورت تمہاری ہائے ہائے
میری قسمت میں لکھی تھی یہ بھی خواری ہائے ہائے
اپنی رخصت کا ابھی سے دل کو گردینا تھا غم
پہلے کر لینی تھی کچھ دن غم گساری ہائے ہائے [۹]

یہاں عورت کے درد و قرب کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک شوہر اس دنیا فانی سے رخصت ہوتا ہے تو ایک عورت کے لیے اس سے مشکل گھڑی نہیں ہوتی کیوں کہ وہ صرف ایک شوہر ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک باپ اور گھر کا سربراہ ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف عورت کا ساتھی اور غم خوار ہوتا ہے بلکہ بچوں اور پورے خاندان کی نگہداشت کرتا ہے جس سے سماجی تعلقات کی بہتری میں اضافہ ہوتا ہے۔ شوہر اور بیوی کی مثال گاڑی کے پہیوں کی طرح ہے جبکہ گاڑی ایک معاشرہ ہے اگر ایک پہیا بھی کام چھوڑ دے معاشرے کا چلتا پھرتا کام رک جاتا ہے اگر حالات اس کے برعکس ہوں تو معاشرے میں بگاڑ کی بجائے توازن ہو گا۔

شادی ایک سنت ہے اور اسلام کا پاکیزہ رشتہ ہے اختر شیرانی ایک نظم میں عورت کی اپنی شادی پہ جذبات کی عکاسی کچھ یوں کرتا ہے۔

میں ہی نہیں ہوں شاداں میرا خدا بھی شاد ہے
جوش بہار پر ہے آج جو بھی مری مراد ہے
لب پہ کسی کا نام ہے دل میں کسی کی یاد ہے
آ کروں تجھ کو پیار جھوم!
اے گل نو بہار جھوم![1]

عورت کی خوشی اور مسرت پوری زوروں پر ہے۔ ہر عورت کے دل میں محبت کا جذبہ فطری طور پہ ہوتا ہے اور جب شادی جیسا خوب صورت مرحلہ عورت کی زندگی میں آتا ہے تو اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی۔ اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ شادی کے ذریعے دو انسان مل کر ایک مکمل زندگی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں شادی کا تصور نہ تھا مگر اس کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں ہوئیں، رفتہ رفتہ اس رشتے کو رواج دیا گیا جس سے مثبت اثرات رونما ہونے لگے۔ پھر شادی کو تہذیب کا حصہ مان لیا گیا۔ تہذیب و تمدن اچھی چیز ہے اور سچ بات ہے کہ انسان کی تمام طر کامیابیاں اسی کی بدولت ہیں۔

سارے گھر میں نو بہار زندگی لایا ہے تو !
میرے ننھے مہمان کس دیس سے آیا ہے تو!
کس بہشت حسن میں اب تک تھا کاشانہ تیرا!
میرے اجڑے باغ میں کیوں کر ہو انا تیرا![2]

اختر شیرانی کی نظم ''ننھا مہمان'' ایک باپ اور شوہر کی دل کی کیفیات ہیں۔ ''بچے جنت کے پھول ہیں'' یہ قول اکثر لوگوں کی زبان پر ہوتا ہے یہ بات نہ صرف خوب صورت ہے بلکہ اس کے معنی بھی ذہن پر خوب صورت نقش چھوڑتے ہیں۔ پھول جیسا بھی ہو جس ساخت میں بھی ہو سب کو بھاتا ہے۔ اس طرح بچہ جیسا بھی ہو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتا ہے۔ ان اشعار میں بیٹے کی پیدائش پر ایک باپ کی خوشی قابل ذکر ہے کیوں کہ بچے سے پہلے اس کا گھر ایک ویران باغ کا نظارا تھا۔ مگر یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ بچے کے آنے سے بیوی کی ساری توجہ شوہر سے ہٹ کر بچے پر آ جاتی ہے۔ اس منظر کی اختر شیرانی بہت خوب صورت تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔

تو نے آ کر میری بیوی کی محبت چھین لی !
اس کا دل چھینا مرے دل کی مسرت چھین لی !
میرے گھر میں مہمان بن کر تو رہزن بن گیا!
اس کا عشق ہوگیا میرا دشمن بن گیا!
اب وہ پہلے کی طرح مجھ پر فدا ہوتی نہیں!
مجھ سے رہتی ہے جدا، تجھ سے جدا ہوتی نہیں![12]

ان اشعار میں ایک باپ اپنے بچے سے شکوہ کر رہا ہے کہ کس طرح تو نے میرے حصے کی محبت چھین لی ہے اور اس کی بیوی کی ساری نظر الفت تمہارے لیے رہ گئی۔ شوہر کی اولین خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بیوی سب سے پہلے اس کو چاہے لیکن یہاں ایک باپ کے ناطے ایسی خواہش بے جان ہے کیوں کہ اگر ماں ایک بچے کو محبت اور توجہ نہیں دے گی تو کون دے گا۔ ایک طرف اس بچے کا باپ بھی اپنی جگہ درست ہے۔ اگر گھر میں توازن قائم رکھنا ہے تو اس لیے مرد کا خیال رکھنا ہو گا کیوں کہ اس سے خاندان میں بدمزگی اور بگاڑ کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا بغور مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ آپ کے بہت سے موضوعات انسان دوستی کے متعلق ہیں۔ انسانیت سماج کی تعمیر نو اور اخلاقی اقدار کے حوالے سے کئی نظمیں لکھی ہیں۔

نو نہال آرزو پھر بارور ہونے کو ہے
قسمت دہکان، مگر تابندہ تر ہونے کو ہے
ظلمت آباد تنزل ہو گا روشن نور سے
حسن لیلائے ترقی جلوہ گر ہونے کو ہے[13]

ابتدائی ادوار میں جب انسان غاروں میں رہائش پذیر تھا تو وہ جانوروں اور زمینی پیداوار پہ گزارا کرتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ کھیتی باڑی کا رواج چل پڑا۔ جیسے جیسے انسان ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا گیا تو کسان کا کردار ابھرنے لگا ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی ضروریات زندگی میں اضافہ ہوتا گیا اور انسانی زندگی روٹی کپڑا اور مکان جیسے بنیادی ضروریات کے بغیر ناممکن ہونے لگی۔

کسان ہمارے سماج کا وہ جاندار فرد ہے جو خود یہ دن رات ایک کر کے لوگوں کے لیے اناج وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔ صبح سویرے اٹھ کر کھیتوں کی طرف جاتا ہے نہ اسے صبح و شام سے سروکار ہوتا ہوتا ہے نہ گرمی، سردی کی پرواہ۔ اگر وہ کام نہیں کرے گا تو ملک میں قحط سالی آتی ہے جس سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس

طرح معاشرے میں بگاڑ جنم لیتا ہے۔ وہ جتنا کام کرتا ہے بدلے میں اس کا معاضہ نہیں ملتا۔ اردو ادب کے مشہور و معروف افسانہ نگار پریم چند نے اس موضوع پر کئی افسانے لکھے ہیں کہ کس طرح یہ طبقہ معاشرے کی ترقی کے لیے کام کرتا ہے اور بدلے میں اسے کچھ نہیں ملتا۔ مگر اس کے باوجود بیٹھتا نہیں ہے اختر شیرانی کہتے ہیں۔

زندگی تازہ آجانے کو ہے دیہات میں
چپہ چپہ ایک فردوس نظر ہونے کو ہے
کتنا احساس ہے تمدن پر ہر کسی دہقان کا
فیصلہ اس کا بانداز دگر ہونے کو ہے[14]

اک نظم "کسان" میں کہتے ہیں کہ

رگ رگ میں جوش محنت و ذوق عمل لئے
کھیتوں سے آرہا ہے کسان اپنا ہل لئے
تن پر قبائے گرد گل افشا کیے ہوئے
محنت کا غازہ رخ پہ فروزاں کیے ہوئے
دنیائے ہست وبود پہ احسان اس کا ہے
خدمت کرے زمانے کی، ایمان اس کا ہے
رقصاں ہے کائنات کی رگ رگ میں اس کا خون
لرزاں ہے شش جہات کی رگ رگ میں اس کا خون![15]

کسان اس سماج کا اہم کردار ہے۔ ہر عہد میں اس کے دم سے خوشحالی ہے۔ مشرقی اور مغربی مصنفین نے کسان کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے۔

ہیری ولیٹس نے اپنی کتاب لینن اور کسان میں کہا ہے (جس کے مترجم جلیس عابدی ہیں)

اگر لینن ۱۹۰۰ء میں سیاست سے دامن چھڑا لیتے تو بلاشبہ روس کے زمینداروں اور کسانوں کے تعلقات کے موضوع پر ایک ماہر حیثیت سے یاد کیے جائے۔ ۱۸۹۰ء کی دہائی ان کی تحریروں کا بنیاد مرکز بحث روسی کسانوں کے حالات تھے۔[16]

یونس حسنی کے بقول:

کسان کو بھی اختر تہذیب اور حیات انسانی کا محسن خیال کرتے ہیں جوش کی طرح ان کی نظر میں بھی کسان "ارتقا کا پیشوا" اور تہذیب کا پروردگار" ہے۔[17]

اس دنیا میں فطرت ہر جاندار کی استاد ہے۔انسان کو اللہ پاک نے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے۔اس لیے وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول اور اشیا سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ابتدا سے انسان شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے گرد پیش کے ماحول سے متاثر ہوا اور اس طرح تہذیب و ثقافت کی طرف قدم اٹھایا۔سماجی تعلقات جانوروں کے ساتھ بھی رکھے جاتے ہیں۔قدیم ادوار میں ہمارے اباوجداد نے جانوروں کی مدد سے اپنی زندگیوں میں آسانی لائی۔گائے، بیل ، بھینس، بکری، مرغی، اونٹ وغیرہ۔ایسے جانور ہیں جنہوں نے پہلے بھی انسان کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا آج بھی بہت سے نظم گو شعرا نے اپنی نظموں میں مختلف جانوروں کو موضوع سخن بنایا۔

اس کائنات میں کچھ جانور ایسے ہیں جنہیں انسان اپنے پاس رکھتا ہے۔یہاں تک کہ سوسائٹی کے بڑے گھروں کی عورتیں اپنے کوٹ کی جیبوں میں پاکٹ ڈاگ لیے پھرتی ہیں۔بعض امیر عورتیں اپنے پالتو جانوروں کے نام جائیدادیں بھی چھوڑتی ہیں۔ آسٹریلوی تحقیق کے مطابق جن لوگوں کو اعصابی دباو اور مایوسی کا سامنا ہوتا ہے جانور پالنے سے اس دباو اور مایوسی میں بڑی حد تک کمی آتی ہے۔یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بچوں کو جانوروں سے بڑی انسیت ہوتی ہے۔اردو ادب میں ہمارے شعرا نے مختلف جانوروں کا ذکر شوق سے کیا ہے مثال کے طور پر اقبال کی بہت سی ابتدائی نظمیں اس حوالے سے ہیں جیسے جگنو ،ایک پہاڑ اور گلہری،ایک مکڑا اور مکھی اور ایک گائے اور بکری وغیرہ کلاسیکی شاعر میر تقی میر نے بھی اپنی شاعری میں مختلف جانوروں کا ذکر کیا۔

اختر شیرانی نے انسان کے ساتھ جانور کو اپنے سماج کا حصہ مانتے ہیں بلکہ وہ خود کبھی کبھار ان سے اپنی دلی کفیات بیان کرتا ہے۔اپنی ایک نظم جوگن میں کہتے ہیں کہ

جنگل کے جانور کچھ بیٹھے ہیں اس کے آگے
رو رو کے جن کو اپنی بپتا سنا رہی ہے
خونخوار شیر بھی ہیں وحشی غزال بھی ہیں
لیکن وہ سب کے دل پر سکہ جما رہی ہے
کچھ سانپ جھومتے ہیں رہ رہ کے مست ہو کر
اک موج وجدان ان کی رگ رگ پہ چھا رہی ہے
طاوس ناچتے ہیں یوں بے قرار ہوکر
گویا ہر ایک پر میں بجلی سما رہی ہے
ایسا سماں بندھا ہے غمگیں نوائیوں سے
رو رو کے جیسے فطرت طوفان اٹھا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے۔[18]

ہمیں جان و دل سے ہے پیاری بندریا
ہے کیا ننھی ننھی دلاری بندریا
مٹھائی کی پھل کی بچاری بندریا
کوئی غیر چھیڑے تو دھتکارتی ہے
خفا ہوتی ہے اور للکارتی ہے
ہمیں پیار کرتی ہے پچکار تی ہے
کہ ان کی نہیں ہے ہماری بندریا[19]

اختر نے بہت سی نظمیں بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ بندر ایک ایسا جانور ہے جس کی بہت سی عادتیں انسان (آدمی) سے ملتی ہیں۔ ہماری سوسائٹی کے بچے اس سے مانوس بھی ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف جنگل میں پائی جاتی ہے بلکہ اکثر لوگ ایسے گھروں میں بھی پالتے ہیں۔ اختر نے جگہ جگہ بندر سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔

ارے آم پر گانے والے پپیہے
مرے دل کو بہلانے والے پپیہے
ذرا ویسے ہی تان اونچی لگادے
سنا دے ! وہی راگنی پھر سنا دے
میں اس وقت پڑھنے سے اکتا گیا ہوں
ہو کھانے کو باغ میں آگیا ہوں[20]

یہ انسانی فطرت ہے کہ جب ایک کام مسلسل کرتا ہے تو وہ اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اختر اپنی پڑھائی سے تنگ آیا ہے اس لیے وہ باغ کا رخ کرتا ہے۔ جہاں انسان نہیں ہے یہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ رومان پسند لوگ انسانی آبادی سے دور جا کر اپنی دنیا بناتے ہیں۔ اختر انسان کے بجائے خوب صورت آواز والے پرندے جسے کوئل بھی کہا جاتا ہے، گفتگو کرتا ہے۔ یہ پرندہ گرم موسم میں آم کے درختوں میں پایا جاتا ہے۔ اختر اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ اپنی سوسائٹی میں انسان کے علاوہ مختلف جانور اور پرندے اہم اور مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔

مجھے لینے نہ آئے اچھے بابل
تمہاری یاد آفت ڈھارہی ہے
یہ برکھارت بھی بیتی جا رہی ہے
مری اماں کو ہو اس کی خبر کیا
کہ چمپا اس جگہ گھبرا رہی ہے
نہ لی بھیا نے بھی سدھ بدھ ہماری
جہاں سے چاہ اٹھتی جا رہی ہے
یہ برکھارت بھی بیتی جا رہی ہے[۲۱]

قدرت نے مرد اور عورت کے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں بنائی ہیں۔انسانی نسل کی بقا کے لیے دونوں کی ضرورت ہے اور سماجی ترقی میں یہ دونوں افراد اہم کردار ہیں۔شادی ایک مقدس رشتہ ہے مگر جب عورت اپنا میکہ چھوڑتی ہے تو وہ سسرال میں زیادہ عرصہ اپنی سہیلوں، بہن بھائیوں اور ماں باپ حتیٰ کہ اپنے بابل کے گھر کی ایک ایک چیز کو یاد کر کے غمزدہ ہوتی ہے۔کیوں کہ اس نے عمر کا ابتدائی حصہ وہاں گزارا ہوتا ہے۔ان اشعار میں ایک شادی شدہ عورت کے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔مگر اختر کے خیال میں سماج کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ عورت کی شادی کے بعد اس کے ماں باپ اور بھائی اس سے کنارہ اختیار کر لیتے ہیں۔اس میں نقصان صرف عورت کا ہوتا ہے۔اور پھر پورے معاشرے کا کیونکہ جب وہ پریشان اور اداس ہو گی تو کیسے ایک صحت مند معاشرے کو ایجاد کرے گی۔اودیس سے آنے والے بتا! اختر شیرانی کی وہ شہرہ آفاق نظم ہے جس کا تذکرہ بہت سے نقادوں نے کیا ہے آپ نے اپنے ایک ہم وطن سے اپنے وطن وہاں کے موسم، باشندوں خوب صورت راتوں، میلوں، بازاروں، عبادت گاہوں، باغوں، پہاڑوں، دریاوں پرندوں، یہاں تک کہ اپنی محبوبہ مرجانہ کا احوال بھی دریافت کرتے ہیں۔اختر کی رومانی نظمیں اپنے سماج سے جڑی ہوئی ہیں۔وہ وطن سے دور ہیں لیکن وہاں کے لوگوں اور خوب صورت فضاوں میں سانس لیتا ہے اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

او دیس سے آنے والے بتا !
اودیس سے آنے والے بتا!
آوارہ غربت کو بھی سنا
وہ باغ وطن فردوس وطن

کس حال میں ہیں یاران وطن ؟
کس رنگ میں ہے کنعان وطن ؟
وہ سرد وطن ،ریحان وطن؟[۲۲]

او دیس سے آنے والے بتا !
او دیس سے آنے والے بتا !
اب نام خدا ،ہوگی وہ جواں
دوشیزہ ہے یا آفت میں اسے
گھر پر ہی رہی ،یا گھر سے گئی
میکے میں ہے یا سسرال گئی
کم بخت جوانی ڈال گئی
خوشحال رہی ،خوشحال گئی
او دیس سے آنے والے بتا ! [۲۳]

اختر شیرانی کی نظموں میں عشق و محبت کے سلوک کی عکاسی:

محبت:

محبت کا لفظ ''حبہ'' سے مشتق ہے اور وہ ایک بیج ہے کہ جب وہ زمین پر پڑتا ہے تو زمین کے اندر پوشیدہ ہو جاتا ہے۔اس پر بارش ہوتی ہے آفتاب چمکتا ہے، سرما اور گرما کا موسم اس پر گزر جاتا ہے لیکن وہ متغیر نہیں ہوتا،اپنے وقت پر اگتا ہے۔اس میں خوش نما پھول لگتے ہیں اور ثمر آور ہوتا ہے۔اسی طرح جب محبت کا دل میں قرار ہوتا ہے۔تو یہ بھی حضور غیبت ،بلا و محنت ،راحت و لذت فراق و وصال سے متغیر نہیں ہوتی بلکہ اس کی نشو نما ہوتی رہتی ہے اور شاخ برگ و شگوفے اس میں پیدا ہوتے ہیں۔[۲۴]

عشق:

عشق کا لفظ ماخوذ ہے ''عشقہ'' سے اور یہ نام ہے اس بیل کا جس کو'' لبلاب'' کہا جاتا ہے اور ہندی میں عشق'' پیچاں'' یہ بیل جس درخت سے لپٹ جاتی ہے اس کو بے برگ و بار کر دیتی ہے

پھر وہ زرد ہو جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد بالکل خشک ہو جاتا ہے اس طرح جب عشق قلب وجود میں پیدا ہوتا ہے تو اس کا درخت وجود بھی معشوق کے جمال کی تجلی میں محو ہو جاتا ہے۔ خود عاشق کی ذات فنا ہو جاتی ہے اور معشوق ہی معشوق رہ جاتا ہے۔[۲۵]

محبت میں شدت آتی ہے اور یہ قوی ہو جاتی ہے تو اس کا نام عشق ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں عشق کو فرط محبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب محبت انسان کے دل پر قبضہ کر لیتی ہے تو پھر وہ اس دنیا جہاں سے بے خبر ہو جاتا ہے اور اسے سوائے اپنے محبوب کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ محبت کسی تریاق کی طرح اس کے بدن میں پھیل جاتی ہے۔ یہ پھر جس چیز کو دیکھتا اور سوچتا ہے تو سوائے محبوب کے وہاں کی نظر نہیں آتا۔ ہر چیز میں عکس محبوب دیکھتا ہے دل کی اس کیفیت کو عشق کہتے ہیں۔

مجنوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب مجنوں کا عشق آخری درجے تک پہنچا تو اس سے کسی نے کہا: کہ دیکھ لیلیٰ آ رہی ہے۔ مجنوں چونک پڑا اور کہا: میں ہی تو لیلیٰ ہوں اور لیلیٰ مجھ میں ہی تو ہے۔ عشق کے درجے پہ پہنچ کر انسان سے اپنا آپ گم ہوتا جاتا ہے اور پھر وہ خود میں محبوب کو دیکھتا ہے۔ عشق کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ عشق حقیقی

۲۔ عشق مجازی

عشق حقیقی:

عشق حقیقی سے مراد اللہ تعالیٰ سے عشق ہے اور جس شخص کو عشق حقیقی کا نشہ چڑھ جاتا ہے وہ انسان دنیاوی محبت کو بھول جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ پر اپنی وحی نازل فرمائی تھی کہ جب میں انسان کے دل سے واقف ہوتا ہوں تو میں اس کے دل میں دنیا اور آخرت کی محبت نہیں پاتا تو اس کے قلب کو اپنی محبت سے بھر دیتا ہوں۔ سچے عاشق کی علامت یہ ہے کہ اس کی نظر میں محبوب کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں سماتا۔ وہ ساری دنیا سے قطع تعلق کر کے خدا کے سامنے جھک جاتا ہے۔ اس کا مقصود اور مطلوب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہو جاتا ہے جو انسان خدا کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے پھر وہ صرف خدا کا طالب بن جاتا ہے۔ اللہ کی ذات سے عشق کرنا عشق حقیقی ہے۔ جس میں نہ کوئی شکایت ہے نہ جدا ہونے کی تکلیف، نہ گناہ کا ڈر اور نہ رسوائی کی فکر۔ یہ عشق جاودانی ہے۔

عشق مجازی:

انسان سے محبت کا نام عشق مجازی ہے۔ یہ وہ محبت ہے جو ایک انسان دوسرے سے انسان لے کرتا ہے۔ اس میں فرد اپنے دل میں دوسرے انسان کے لیے جگہ بناتا ہے۔ وصال و فراق، ہجر میں پھنسنا، وصال کی خوشی وغیرہ اس کے بنیادی عناصر ہیں۔ اس میں کبھی تو عاشق کو بے پناہ سکھ اور خوشی ملتی ہے اور کبھی ہجر کے دکھ اور معشوق سے جدائی

۔اس میں معشوق کبھی کبھی اپنے عاشق پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور محبت کا جواب محبت میں دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس میں ایک اور کردار بھی آتا اور وہ ہے رقیب۔ یہ ایک ایسا عشق ہے جس میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ انگریزی اور اردو ادب کی نثر و شاعری میں اس کا ذکر کثیر مقدار میں ملتا ہے۔ عالم، صوفی اور ادیب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ عشق مجازی اکثر اوقات انسان کو حقیقی عشق کی طرف لے جاتی ہے اس کی بڑی مثال یوسف سے زلیخہ کا عشق تھا۔

عشق وہ جذبہ ہے جو انسان دوسری اقوام سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ جذبہ جھوٹ، عیاری اور چالاکی سے پاک ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کو بلندی اور آفاقیت سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس میں انسان خود کو گم کر دیتا ہے او اپنے آپ میں صرف اپنا معشوق دیکھتا ہے۔ عشق وہ جذبہ ہے جس کو ماضی میں جن اقوام نے اپنایا وہ آج بھی زندہ ہیں مثال کے طور پر اقبال کے شعر کا ایک مصرع ملاحظہ ہو۔

''قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے''

عشق وہ قوت ہے جسے اپناہ کر انسان عروج کی طرف لے جاتا ہے اور زوال اس کو چھو کر نہیں گزرتا۔ عظیم پیغمبر حضرت ابراہیم کو نمرود نے آگ میں ڈالا اسے خدا سے عشق تھا۔۔ اگر اس کے دل میں عشق کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ کبھی خود کو آگ کے حوالے نہ کرتا۔ حالاں کہ خدا نے ان پر کرم کر کے وہ آگ آپ پر گلزار بنادی۔ یہ سب عشق کے جذبے کی بدولت تھا۔ عشق اپنی راہ میں کوئی روکاوٹ اور دیوار نہیں دیکھتا نہ تند و تیز سیلاب سے نہ زمانے کے گرم و سرد سے ڈرتا ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال عقل کے مقابلے میں عشق کو ترجیح دیتے ہیں۔ عشق کے بدولت انسان کی ساری صلاحیتں سامنے آتی ہیں۔ عشق اس کائنات کی وہ بنیادی شے ہے جس کے بغیر اس کائنات کی چہل پہل، رونق، رنگینی و دلکشی ممکن نہیں۔ عشق مجازی کی سیڑھی پر چڑھ کر انسان عشق حقیقی تک پہنچ جاتا ہے۔ مجازی عشق عشق حقیقی تک انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے بغیر عشق حقیقی تک رسائی ممکن نہیں۔ پھر جب انسان عشق حقیقی کو پالیتا ہے تو دنیا کی کوئی خواہش اس کے دل میں باقی نہیں رہتی۔

اختر شیرانی کی نظموں میں عشق و محبت کے سلوک کی عکاسی:

بقول ڈاکٹر یونس حسنی:

اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری کا سب سے نمایاں اور ممتاز عنصر رومانیت ہے۔[۲۶]

عشق و محبت تہذیب و ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔ اگر دنیا سے اس جذبے کو ختم کیا جائے تو سارے نظام کا چلنا نہ ممکن ہو جائے گا۔ اختر کو تنقید نگاروں نے عشق و محبت کا حامل شاعر کہا ہے۔ ابتدا ہی سے آپ عاشق مزاج اور حسن پرست انسان ہیں۔ آپ کی نظموں میں دوسرے پہلوؤں کی بہ نسبت رومان زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ عشق و محبت کے نغمے گاتا ہے مگر وہ صرف اپنی محبوبہ اور عورت کو نہیں پکارتا نہ صرف عورت کے عشق میں مبتلا ہے بلکہ مذہبی اور قابل قدر شخصیات سے بھی والہانہ عشق کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں وہ کسی بڑے مذہب پرست سے پیچھے نہیں ہیں۔ ذاتی امور کے علاوہ سماجی معاملات کے لیے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اپنے آخری نبی اور دوسرے صحابہ کی مدح میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ''اذان'' جیسے بہترین موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

اختر کی شاعری دونوں جنگ عظیم کے درمیان سامنے آتی ہے۔ اس وقت حالات تیزی سے بدل رہے تھے ۔ ہر شخص سیاست میں حصہ لے رہا تھا۔ اختر کو بھی اپنے وطن سے محبت ہے۔ اختر آزادی کے طرفدار اور عاشق تھے کئی نظموں میں خود کو وطن پہ قربان ہونے کی آرزو کی ہے۔ اختر نے جنگ کے موضوع پر کئی نظمیں لکھی ہیں جن میں جنگی ترانہ، نعم البدل اور دلیران وطن قابل ذکر ہیں۔

احتشام حسین کہتے ہیں۔

> ان کی نظموں سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ ان کی وطن دوستی اور آزادی پسندی کا جذبہ ہے جس میں ریاکارانہ سیاسی جتھ بندی کے خیالوں کی آمیزش نہیں ہے۔ ان کے جنگی ترانے میں خلوص ہے گو سیاسی شعور نہیں ہے اور ایک رومانوی شاعر کا خلوص ہی اس کے کردار اور خیال کے متضاد پہلوؤں میں یک رنگی اور صداقت پیدا کرتا ہے۔[۲۷]

اختر کو بچوں سے بے لوث محبت ہے انہوں نے کائنات کے ان پھولوں کے لیے نظمیں لکھی۔ اپنی کچھ نظموں میں بچوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اختر نے بچوں پر قلم اٹھاتے ہوئے ان کی ذہنی سطح اور نفسیات کو سامنے رکھا ہے۔ پھولوں کے گیت اختر کی نظموں کا وہ مجموعہ ہے جو بچوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس میں بعض نظمیں کھیل کود، وطن پرستی، شب برات اور نئے سال پر ملتی ہیں۔ کچھ نظمیں مناظر فطرت اور اخلاق پر بھی ہیں۔

اختر کو عورت کے ہر روپ سے محبت ہے۔ اس کے خیال میں عورت ایک مضبوط حوالہ ہے اور بار بار اس کا اظہار کرتا ہے کہ اس کائنات اور ہماری زندگی پر عورت کی خدائی ہے۔

بقول اقبال:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں[۲۸]

اختر کے ہاں بے شمار ایسی منظومات ہیں جس میں وہ صرف عورت کے شیدائی ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ، مذہب ، مناظر فطرت اور اس کائنات کے ذرے ذرے سے محبت کے دعویدار ہیں۔ آپ نے سماجی، سیاسی، اصطلاحی، مذہبی اور قومی ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ رومانیت کے علاوہ حقیقت پسندی سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ہاں اس قسم کی شاعری میں زیادہ تاثیر نہیں جو ان کی رومانوی شاعری میں ہے لیکن اسس کے باجود اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ رومانوی شاعری کے مقابلے میں غیر رومانوی شاعری تھوڑی پھیکی دکھائی دیتی ہے۔ اگر ہم ان کی رومانوی شاعری سے تھوڑی نظر ہٹائے تو ان کی شاعری کے دوسرے خصوصیات واضح ہو جاتیں ہیں۔

بقول نیر واسطی:

> مشرق میں رومانی شاعری کے تین پیغمبر آئے ہیں۔ ایک امراوالقیس، دوسرا حافظ شرازی اور تیسرا اختر شیرانی۔ جس کی زبان حافظ کی تھی اور تخیل امراوالقیس کا۔[29]

صدیوں کے بعد اگر مشرق میں کوئی رومانی شاعر آیا جس نے شعر وادب کے میدان میں رومانی نغمے الاپے تو وہ اختر شیرانی نے ہیں۔ رومان کے پردے میں زندگی کے مختلف مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ عشق و محبت جیسے جذبے کو کائنات کی مختلف چیزوں میں بہت باریک بینی سے دیکھا۔

اختر اگر ایک عورت کو چاہتا تو سماج کی اونچ نیچ کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ اپنے ارد گرد رشتوں اور قید و بند کا خیال کرتا ہے۔ اس حوالے سے یونس حسنی کہتے ہیں:

> عشق میں بے باق ہونے کے باوجود وہ اک پردہ نشین کو صرف اس لیے یاد کرنے سے اجتناب کرتے ہیں کہ کہیں وہ بدنام نہ ہو جائے۔[30]

اختر اس کائنات کے جس چیز سے بھی محبت کرتا ہے تو اس کے لیے سجدہ کرنا لازمی قرار دیتا ہے یا پھر اس کی محبت میں عمریں گنوانے کا ہنر جانتا ہے۔ عبادت بریلوی اپنی کتاب جدید شاعری میں فرماتے ہیں کہ

> اردو شاعری سے دلچسپی لینے والوں کو اپنے احساس جمال اور جذبہ عشق کی تسکین کے لیے پیچھے کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ اپنی تسکین کا ساماں انہیں جوش، اختر شیرانی، حفیظ۔۔۔۔۔۔ ساحر لدھیانوی وغیرہ کی عشقیہ شاعری میں ملتا ہے۔[31]

اختر نے اللہ کی ذات اپنے آخری نبیؐ اور بہت سے اولیائے کرام اور صحابہ سے دلی محبت کی۔ بعض نظموں میں ان کا مذہب سے لگاو پورے زوروں پر ہے۔ اپنی عمر کا ایک زیادہ تر حصہ حرافات میں گزارنے پر اپنی تہی دامنی کا احساس زیادہ ہے اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں۔

چمن زار قضا میں ایک مرغ پر شکستہ ہوں
مجھے قدر آزمائے ذوق پرواز بتا کر دے!
سکھادے طفل دل کو درس ،اخلاص و محبت کا
زباں کو بے نیاز شکوہ مکر و دغا کردے !
کس سے مجھ کو کینہ ہو عداوت ہو نہ نفرت ہو
ایاغ دل کو لبریز مئے صدق و صفا کردے! [۳۲]

پھر فرماتے ہیں

تیرا اختر تیری سرکار میں اک عرض لایا ہے
اسے کیا ہو ،اگر تو کامیاب التجا کردے! [۳۳]

عمر کا زیادہ حصہ جب غلطیوں اور خرافات کی نظر ہوا تو اختر یہاں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ مجھے راہ راست پر لانے والی ذات ایک اللہ کی ہے۔اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں جس سے ایک گناہ گار انسان کچھ مانگے اور یہ خدائے عشق کا تقاضا ہے کہ اس محبوب کے سوا کسی غیر اللہ کے سامنے دست دراز نہ ہو۔

غلام دستگیر کے خیالات یہاں اختر سے ملتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ :

> اس کے سوا کوئی نہیں جس کے قانون کو قانون تسلیم کیا جائے۔اس کے سوا کوئی نہیں جس کو انسان اپنے سے بالاتر سمجھے اور جس کے آگے ذلت، غلامی نیاز مندی اور محکومی اختیار کرے۔ [۳۴]

اختر اس کائنات کی ہر خوب صورتی کی وجہ خدائے برتر کی ذات کو قرار دیتے ہیں۔اس بارے میں کہتے ہیں۔

خدا کی قدرت کے ہیں نظارے
زمیں پہ پھول آسماں پہ تارے !
سمے ہیں یہ کیسے پیارے پیارے
زمیں پہ پھول آسماں پہ تارے!
وہ سارے سنسار کا خدا ہے

سب اس کی قدرت ہی سے بنا ہے [۳۵]

اختر دنیا کے حسین نظاروں اور نقش و نگار کے خالق کی تعریف و توصیف بیان کر رہا ہے۔ یہ ان کے عشق کی انتہا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے زرے میں محبوب خدا کو تلاش کر رہا ہے۔ اک اور نظم '' خدا کی تعریف'' میں فرماتے ہیں۔

یہ ننھے ننھے
یہ پیارے پیارے
باغوں میں تو نے
پودے اگائے !
پھول اور پھل سب
تو نے بنائے !
تو نے ہم کو
پڑھنا سکھایا!
لکھنا سکھایا
پڑھنا سکھایا!
ہے عام سب پر
احسان تیرا!
اختر کو یا رب
دھیان تیرا! [۳۶]

اختر نے خدا کا شکر ادا کیا ہے کیوں کہ یہاں ان کی مراد اپنی شاعری میں بڑے رتبے کی ہے۔ اس پر وہ خدا کا شکر گزار ہیں کہ خدا نے اسے دنیا ادب میں بڑا مقام عطا کیا ہے۔ خدا پر ایمان لانے میں اور اس کی حمد و ثنا کرنے میں اختر کو کسی بڑے مذہبی اور مدح نگار سے کم نہیں۔

اختر نے آپؐ کی ذات مبارک سے بے حد محبت کی کیوں کہ آپ کا زیادہ کلام نعتوں پر مشتمل ہے۔ اختر شیرانی نے ایسی نعتیں لکھی ہیں جن میں آپؐ سے عشق کا سمندر پوری موجوں کے ساتھ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس حوالے سے شعر ملاحظہ ہو۔

مرے دل میں ہزاروں طور سینا جگمگا اٹھے
کچھ اس انداز سے دل میں تیرا شوق تمام آیا
بشر تھا وہ مگر ایسا ،جسے خیرالبشر کہے
غریبوں کی خبر لی اس نے بیماروں کے کام آیا
زبان چپ ہوگئی جب دل نے چھیڑا تذکرہ ان کا
دلوں کو وجد آیا ،جب زبان پر ان کا نام آیا[۳۷]

ان کی نعتوں میں پیغمبر اسلام سے عشق پورے زوروں پر ہے۔ان کی نعتوں میں غزل جیسا سوز و گداز ہے۔ جب قاری ان کی نعتوں کو پڑتا ہے تو ایک نشے اور سرور کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتح پوری اختر کی نعت گوئی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ :

اختر شیرانی کے نعتیہ کاوشات میں ایک معتدل و متوازن اور کیف آور گداز ہے۔ان کی نعتیہ نظمیں مترنم اور شیریں ہیں۔[۳۸]

مسند نشین امکاں ،تمہیں تو ہو!
اس انجمن کی شمع فروزاں تمہیں تو ہو!
دنیائے ہست و بود کی زینت تمہیں سے ہے
اس باغ کی بہار کے ساماں تمہیں تو ہو!
روشن ہے جس کی ضو سے شبستان زندگی
وہ ماہ نیم ماہ شبستان تمہیں تو ہو![۳۹]

اختر اس کائنات کی ہلچل اور اس نظام کے چلنے کی وجہ آپؐ کی ذات مبارک کو قرار دیتے ہیں۔آپؐ کی ذات ان کے لیے کسی چاند سے کم نہیں جس کی روشنی میں دنیا کا کارخانہ اندھیرے سے بچ کر چل رہا ہے۔

اختر شیرانی کو حضرت علی سے بے پناہ محبت ہے۔وہ اپنی یادوں میں حضرت علیؑ کو بسانا چاہتے ہیں۔یہاں تک کہ وہ اپنی شاعری اور باتوں کی مٹھاس کو اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ حضرت علی کے کارناموں کا ذکر کریں۔اختر نے ایک نظم " یادگار علی" کے عنوان سے لکھی ہے اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

علی کرم کہ نقشہ خیبر مٹادیا جس نے
قضیات جنگ میں محشر جگا دیا جس نے
حصار چرخ بریں کو ہلادیا جس نے
جہاں کو تیغ کاجوہر دکھا دیا جس نے
ہے اب بھی یاد زمانے کو زوالفقار علی
علی کرم کی یاد ہے دنیا میں یاد گار علی ؓ

اختر نے صنعت تلمیح کااستعمال کرکے ایک ہی بند میں حضرت علی کی بہادری اور شان وشوکت کو بیاں کیا۔یہ شاعر کا خاصہ رہاہے کہ اپنی نظموں میں ان بہادر اور اسلام کے درخشاں ستاروں کے ذکر سے عوام میں بیداری پیدا کی ہے۔ حضرت علی جیسی شیر بہادر ہستی نے یہودیوں کو شکست دے کر قلعہ خیبر کو فتح کیا اور مسلمانوں کی عظمت کو برقرار رکھا۔

اختر کی نظموں میں مذہبی احکام کی پابندی ملتی ہے۔اذان ایک ایسا اعلان ہے جو ایک مسلم معاشرے کو اکٹھا ہونے اور اللہ کے قریب لانے کے لیے کیا جاتاہے۔اختر اذان کی تعریف وتوصیف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

روح آفاق میں جس کو شرر افشاں دیکھا
وہ صدا جس کو دل و جاں مسلماں کہیے
نغمہ بے خود رحمت گہہ یزداں کہیے !
سینہ دہر میں ہر سو ،جسے رقصاں دیکھا!
روزوشب اور مہ وسال گئے پھر آئے !
اس کا مستانہ تلاطم ابھی تک ہے برپا
لب فطرت کا تبسم ہے ابھی تک برپا
کتنے ماضی مٹے اور حال گئے ،پھر آئے
دشت وصحرا وجبل ،جس سے دہل جاتے ہیں
جس سے ہیں لرزہ براندام ، ستارے اب بھی
جس سے کانپ اٹھتے ہیں دنیا کے نظارے اب بھی
لات وعزے وہبل ،جس سے دہل جاتے ہیں !
یہ اذاں ہے کہ ہےاک عظمت سرشار و جواں !

قلب مسلم کی اک دولت بیدار جواں! [41]

اختر شیرانی عورت اور رومان کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ آپ نے ماں کی ماتا کو محسوس کیا اور اپنی رومانی نظموں میں اس کی عکاسی کی۔ ماں ایک ایسی عظیم ہستی ہے جس سے نسل انسانی بڑھتی ہیں اگر ماں بچوں کی تربیت اور پرورش اچھے اور خوب صورت انداز سے کرتی ہے تو اس سے ایک تہذیب یافتہ قوم سامنے آتی ہے۔ اور یہی قوم آگے مل کر دنیا میں فخر کا باعث بنتی ہے۔ کہا جاتا ہے ماں کی گود بچے کے لیے اولین درسگاہ ہے۔

ماں انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی سب پہلی اور سب سے بڑی نعمت ہے جس کے بطن میں اسی کا خون
اور غذائی اجزا سے انسان کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔ [42]

ماں ایک ایسا رشتہ ہے جو ہر عہد میں قابل عزت اور قابل محبت رہا ہے۔ اختر شیرانی کہتے ہیں کہ:

کرشمہ آرائی ہائے احساس حسن کے باوجود اب تک
نہ کہہ سکا کوئی شاعر، آخر وہ نغمہ دل پذیر کیا ہے؟
جو سب سے دلکش ہے، دلربا ہے؟
مگر میں کہتا ہوں کہ وہ نغمہ ---آہ دلگداز نغمہ
جو ساری دنیا کے سارے رنگین ترانوں کی اصل وابتدا ہے
جو قلب فطرت کا آئینہ ہے!
وہ نغمہ-- وہ کائنات کا -- کائنات کا سحر کار دل ہے
وہ دل کہ جس کا جہاں والوں نے پیار سے نام ''ماں'' رکھا
وہی محبت کی ابتدا ہے
وہی محبت کی انتہا ہے [43]

اختر ماں کے عشق میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ کائنات کا حسین ترانہ اپنی ماں کی ذات کو قرار دیتا ہے۔ وہ خوش ہے کیوں کہ اس نے ماں سے محبت کا راز پالیا ہے۔ جب کہ باقی شعرا اس کے جاننے سے محروم ہیں۔ ان کے نزدیک ماں کی محبت ایک ایسی رنگین تصویر ہے جس میں دنیا کے حسین رنگ بکھرے پڑے ہیں۔

نظم ''مامتا'' میں اختر کہتے ہیں کہ

وہ جذبہ جو نسائی جذبوں کا منتہا ہے
دنیا میں نام اس کا ماں کی مامتا ہے [44]

عورت ہر رشتے کے طور پر اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ چاہے وہ بیٹی ہو، بہن ہو، بیوی ہو مگر جب عورت ماں کے رشتے میں سامنے آتی ہے تو پھر عورت کے تمام رشتوں پر فوقیت حاصل کرتی ہے۔ ماں اولاد کے لیے آب حیات کا درجہ رکھتی ہے۔

غم ہائے زندگی میں تسکین بھی یہی ہے
ہاں ماں کی مامتا کا آئین بھی یہی ہے
بچے سے خوش پر ان کے خوابوں میں کھو رہی ہے
اک آنکھ ہنس رہی ہے اک آنکھ رو رہی ہے[۴۵]

انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے بعد والدین کے حقوق واجب ہیں۔ ماں کی ذات وہ واحد ذات ہے، جو بچے کے آرام و راحت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے نہ سوتی ہے نہ سکون سے بیٹھتی ہے، جب تک اس کا بچہ اس معاشرے میں بلند مقام حاصل نہ کریں۔ بچے کی کامیابی پہ خوش اور اس کی ناکامی پہ ماتم زدہ رہتی ہے۔ چند انبیا اکرام اور مصنفین ادب نے ماؤں کی عزت و تکریم کی اور اپنے عہد سے لے کر موجودہ عہد تک خود کو زندہ جاوید کیا۔ اختر اپنی نظم "آخری امید" میں لکھتے ہیں۔

خدا رکھے جواں ہو گا ! تو ایسا نوجوان ہوگا!
حسین وکامراں ہو گا ! دلیر و تیغ داں ہوگا !
بہت شیریں زباں ہو گا! بہت شیریں بیاں ہوگا!
مرا نھا جواں ہوگا![۴۶]

ماں کی فطرت میں یہ بات ہمیشہ رہتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے دعا گو ہوتی ہے۔ یہاں ایک ماں اپنے بچے کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ سارے زمانے کا محبوب اپنے بچے کو بنانا چاہتی ہے۔ وہ ماں کی زبانی کہتے ہیں۔

وطن کے نام پر اک روز یہ تلوار اٹھائے گا!
وطن کے دشمنوں کو کنج تربت میں سلائے گا!
اور اپنے ملک کو غیروں کے پنجے سے چھڑائے گا!
غرور خاندان ہوگا!
میرا نھا جواں ہوگا![۴۷]

دنیا میں جو عظیم مائیں گزری ہیں۔انہوں نے ہمیشہ اپنے جگر گوشوں کو جہاد کے سپرد کیا۔مائیں ہمیشہ اپنے بچے کی کامیابی و کامرانی کی خواہش مند ہوتی ہیں۔بقول احتشام حسین:

> ان نغموں میں جو بات ظاہر ہوتی ہے،وہ وطن کی دوستی اور آزاد پسندی کا جذبہ ہے جس میں ریاکارانہ سیاسی جتھ بندی کے خیالوں کی آمیزش نہیں۔[۴۸]

میتھیو آرنلڈ کے الفاظ میں ادب تنقید حیات ہے۔ادب ہوا میں تخلیق نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ انسان کے مشاہدے اور تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔شاعر جو کہتا ہے وہ صرف اس کی اندرونی جذبات نہیں ہوتے بلکہ وہ اس کے خارجی حالات کا ایک ناقدانہ جائزہ ہوتا ہے۔یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ادب ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی سے متاثر ہوتا ہے۔مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں۔

> ادب بھی تاریخ ہے جس میں کسی ملک یا قوم کے دور بہ دور بدلتے ہوئے تمدن کی مسلسل تصویریں نظر آتی ہیں۔[۴۹]

نثر اور شاعری میں بیش بہا اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب ملک میں کوئی انقلاب برپا ہو رہا ہو۔اختر جب نظم کہہ رہا تھا اس وقت ہندوستانی حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ہر شخص سیاست میں کچھ نہ کچھ حصہ لے رہا تھا کیوں کہ جنگ عظیم کا دورانیہ تھا اختر ان حالات سے باخبر تھے۔انہوں نے کئی سیاسی اور قومی نظمیں لکھی۔ہر کوئی چاہ رہا تھا کہ ہندوستان اجنبی حکمرانوں سے آزاد ہو جائے آزادی سے محبت اختر کے ہاں شدت سے ہے۔وہ آزادی کے لیے عشق کو قربان کر دینا چاہتے ہیں۔

عشق و آزادی بہا ر زیست کا ساماں ہے
عشق میری جان ، آزادی مرا ایماں ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے[۵۰]

اختر عشق و محبت کے فنکار ہیں لیکن یہاں آزادی کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ وہ عشق کو آزادی پہ قربان کرنا چاہتا ہے۔سبط حسن نے آزادی کی نظمیں کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔جس میں اردو ادب کے چند خاص شعرا کی نظمیں شامل ہیں جن کا موضوع آزادی تھا۔ان میں اختر کی ان نظموں کا تذکرہ ہے جن میں وہ آزادی کے پرستار اور خواہش مند ہیں۔

اختر شیرانی میدان جنگ کے نوجوانوں سے مخاطب ہیں کہ:

نغمہ حب وطن گائے چلو
جنگ کے میدان کو گرمائے چلو
ابر کی صورت بڑھو چھاتے ہوئے
بجلیوں کی طرح لہراتے چلو
وادی و میدان و کوہ دشت کو
دشمنو ں کو خون سے نہلائے چلو [۵۱]

اختر نے ہندوستان کے نوجوانوں کو پیغام دیا ہے کہ خود کو دشمن کے مقابلے میں اتنا تیز کرو جیسے بجلی اپنے تاروں میں تیزی لہراتی ہے۔ اختر کی نظم ''بڑھے چلو'' ایک ایسا ترانہ تھا جسے ہندوستان کے بعض علاقوں میں فوجی جماعتوں نے مختلف مقامات پر گایا ہے۔

جس جگہ انسان پیدا ہوتا ہے اور بڑھا ہوتا ہے۔ وہاں سے محبت فطری طور پر انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جب انسان اس دنیا میں آیا چاہے وہ اولین ادوار کا وحشی اور جنگلی کیوں نہ تھا، اس نے بھی اپنے قبیلے اور خطے کی حفاظت کی جس طرح وہ دھرتی اس کی ماں ہو۔ یہ ہی حال اختر کا تھا انہوں نے بہت سی نظموں میں جنگ کو موضوع بنایا مگر وہ جنگ باز نہیں بلکہ امن پسند ہیں۔ جنگ عظیم کے ختم ہونے پر خوشی کا اظہار کیا وہ کہتے ہیں۔

پھر مطلع عالم سے چھٹے جنگ کے بادل
اللہ کی رحمت سے گھٹے جنگ کے بادل
پھر مشرق و مغرب سے ہٹے جنگ کے بادل
پھر فتح کا دن ''خاتمہ'' جنگ کا دن ہے!
اٹھ ساقیا اٹھ ،خاتمہ جنگ کا دن ہے! [۵۲]

اختر اور سلمیٰ:

اختر کی نظمیں اور سلمیٰ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزم بن گئے ہیں۔ بعض ناقدین نے یہ بھی کہا کہ حقیقت میں سلمیٰ نام کی کوئی لڑکی نہیں تھی جو اختر کے عشق کا مرکز و محور تھی۔ مگر اختر کی شاعری میں سلمیٰ کا ذکر اتنی

تواتر سے ملتا ہے کہ اس سے انکار ناممکن ہو گیا ہے۔ اختر نے اور بھی محبوباوں کا ذکر زیادہ سے زیادہ کیا لیکن ان کی نظموں پر سلمیٰ پر زیادہ حاوی ہے۔ بقول ایس۔ اختر جعفری:

> جب اختر شیرانی کا ذکر چھڑتا ہے تو بات گھوم پھر کر سلمیٰ کی گھنی زلفوں اور شبنمی عارضوں پر جا کر ٹھہرتی ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا سارا سکون انہی زلفوں کے سائے میں اور زندگی کی تمام تر خوشی انہی عارضوں کی ہم نشینی ہیں۔[۵۳]

اختر شیرانی اور جان کیٹس کی شاعری کے بہت سے پہلو ایک جیسے ہیں۔ اختر کی سلمیٰ اور کیٹس کی فینی ان کے شاعری کے اہم ستون ہیں۔ اگر یہ کردار ان کی شاعری سے نکال دیے جائے تو ان کی شاعری کا تمام تاثر ماند پڑ جائے گا۔ اردو شاعری میں محبوب بازاری رہا ہے لیکن آپ کے ہاں بازاری پن نہیں۔ آپ نے سلمیٰ کو ایک عورت کے روپ میں دکھایا اور اس کے توسط سے کائنات کے بہت سے راز فاش کیے۔ اس کردار کے بغیر اختر کی شاعری بے رونق اور بے مزا ہے۔

سلمیٰ اختر کے لیے بے چین رہتی ہے اور ریحانہ وادی میں اس کا انتظار کرتی ہے۔ اختر نے اپنی سلماوں، عذراوں اور ریحاناوں کے پردے میں ایک عورت کو موضوع سخن بنایا۔ چاہے وہ دیہات کی نئی نویلی دلہن ہو بچھڑی سہیلیاں ہو یا کوئی ہجرہ نصیب بیوی یا کسی بچے کی ماں یا پھر کسی کی محبوبہ وہ کہتے ہیں۔

حجاب و عصمت شرم و حیا کی کان ہے عورت
جو دیکھو غور سے ہر مرد کا ایمان ہے عورت
اگر عورت نہ ہوتی کل جہاں ماتم کدہ ہوتا
اگر عورت نہ ہوتی ہر مکاں اک غم کدہ ہوتا[۵۴]

عورت کی بادشاہت اس کائنات پہ جاری وساری ہے۔ اگر عورت نہ ہوتی یہاں خوشیاں اور گہما گہمی ختم ہو جاتی۔ ایک عورت کے بغیر یہ دنیا بھی ویران لگے گی۔ آپ کی محبوبہ ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بھی انسان ہے اور وہ بھی محبت کر سکتی ہے۔ اقبال کے خیال میں عورت اختر کے اعصاب پر بری طرح سوار ہے۔ گوئٹے کہتا ہے محبت اور دور کا جذبہ اس کائنات کی ہر چیز میں ہے لیکن اس کا جیتا جاگتا نمونہ عورت ہے۔ بقول اختر:

وہ روتی تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے
وہ ہنستی ہے تو فطرت بے خودی سے مسکراتی ہے!
وہ ہنستی تو ساتوں آسماں کو نیند آتی ہے!

وہ اٹھتی ہے تو کل خوابیدہ دنیا کو اٹھاتی ہے! [۵۵]

اختر عورت کے حسن سے متاثر ہے۔ وہ اس کو چاہتے بھی ہیں لیکن تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں نکلے۔ اس کے نزدیک عورت ایک پھول کی مانند ہے مگر وہ اس پھول کو ہاتھ لگانے سے گریز کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ عورت کو بہت غور سے دیکھتا ہے اور ایسے موقوں پر دیکھتا ہے۔ جن حالات میں ایسے نگاہوں کی فرصت نہیں ہوتی ۔ جیسے جوش ایک ''سہاگن بیوہ'' کو اپنے شوہر کی موت پر روتے دیکھتا ہے تو وہ اس وقت اس بیوہ کی جسم کے مختلف حصوں کو دیکھتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے دل میں کچھ اور جذبات بھی امڈ آتے ہیں۔

اختر ایک مشرقی معاشرے کے نظم گو ہیں۔۔ وہ عورت کے لیے پردے سے محبت کرتے ہیں۔ جو عورت پردہ کرتی ہے وہ اس کی نظروں میں قابل عزت ہے۔ وہ عورت کو پردے میں دیکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ اس سے اس کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ ہم انسانوں سے پوشیدہ ہے حالاں کہ اس کی برابری کوئی نہیں کر سکتا تو پھر عورت کیوں اپنے حسن کو لوگوں پہ آشکارا کرے۔ اختر کہتے ہیں کہ :

لعل پنہاں ہے اگر کان کے گنجینے میں
برق رخشاں ہے ابر کے آئینے میں
جب ہر اک طرف لطافت ہے نہاں پردے میں
پھر برا کیا ہے جو عورت ہے نہاں پردے میں [۵۶]

اختر نہ صرف اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت کرتے ہیں بلکہ اپنے قرآن و سنت پہ بھی عمل پیراں ہیں۔ قرآن و حدیث بھی عورت کے لیے پردہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ عیسائی اور ہندو تہذیب میں جن لوگوں نے عورت کا پردہ ختم کیا ان کا خاندانی نظام درہم برہم ہو گیا۔

اختر اردو ادب کا وہ رومانی ستارہ ہیں جنہوں نے اپنے عشقیہ معاملات کو کھلم کھلا بیان کیا۔ چاہے وہ محبوب سے وصل کا وقت ہو، یا ہجر کی رات کا یا پھر محبوب کی یاد کا اختر نہ صرف موجود لمحات میں اپنی محبوبہ سے عشق کرتا ہے بلکہ وہ بیتے ہوئے دنوں کو بڑی خوب صورتی سے بیان کرتا ہے۔ اردو ادب میں ایک نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اختر سے پہلے دوسرے نظم گو نے عشقیہ معاملات کو بیان کیا لیکن اختر کے ہاں اس میں پوری شدت ہے۔

اختر ریحانہ سے محبت کرتا ہے۔ وہ عورت ان کی نظر میں حسین و جمیل ہے جس نے اختر کو محبت کا جواب محبت سے دیا ہے اور اس احساس سے اختر خود کو ایک کیف و سرور جیسے عالم میں محسوس کرتا ہے۔ مثال کے طور پر

وہ اس ٹیلے پر اکثر عاشقانہ گیت گاتی تھی
پرانے سورماؤں کے فسانے گنگنا تی تھی
ہیں پر منظر وہ میری ہے تا بانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی [۵۷]

بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

اختر بلاشبہ اردو کا سب سے بڑا رومانی شاعر ہے۔ جس کی خوبیاں اور خامیاں رومانیت کی دین ہیں۔ جو مغربی رومانی افکار کا مبلغ ہوتے ہوئے بھی مشرقی مزاج کا شاسا ہے جس کی شاعری میں مانوس جدتوں اور جدید قدامتوں کی رنگین لہریں ہیں اور عشق و سرمتی اور وجد و کیف کے طوفان۔ [۵۸]

سلمیٰ اختر کی نظموں پر حاوی ہے۔ وہ سلمیٰ کو اپنی کل کائنات تصور کرتے ہیں۔ وہ اس کے عشق میں ایسے ڈوبے ہیں کہ نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ وہ سلمیٰ سے ملاقات کی تیاریاں بہت جوش و جذبے سے کرتے ہیں اور ایسی مثال اردو نظم نگاری میں نہایت کم ملے گی۔ وہ سلمیٰ کے انتظار میں بے تاب ہیں۔ مثلاً:

زمین پر بھیج دے آج اے بہشت اپنی بہاروں کو
بچھادے خاک پر اے آسماں اپنے ستاروں کو
خرام و رقص کا دے حکم فطرت ، ابر پاروں کو
وہ بے خود چاند کی نظروں سے گھبرائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں [۵۹]

تخیل کی کارفرمائی زوروں پر ہے کیوں کہ جنت کی بہاروں کو زمین پر لانا، ستارے زمیں پہ لانا ایک نہ ممکن سی بات ہے لیکن یہ ایک رومان پسند کے پسندیدہ جملے ہیں۔ پہلے بتا گیا ہے کہ اختر کا عشق زوروں پر ہے اور اس کے اظہار کے لیے ایسے جملوں کا استعمال کرنا کوئی انہونی بات نہیں۔

اختر کی محبوبہ گوشت پوشت کی انسان ہے۔ وہ ایک ایسے رومانی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جو ہر گز یہ نہیں چاہتا کہ عورت ذات کسی غیر کے دست لمس سے آشنا ہو جائے اور اگر ایسا ہو جائے تو اسے وہ عورت گناہوں کا میخانہ لگتی ہے یا پھر فحش ترانہ۔ یہ سب اختر کے ارد گرد مشرقی روایات کا نتیجہ ہے۔ وہ چاہے بھی تو اپنی روایات اور اقدار سے دور نہیں جا سکتا۔ وہ تنہائی میں محبوب کے ساتھ چند لمحے گزارتا ہے۔ اس کے لیے یہ کسی معراج سے کم نہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے لیے ایک خیال دنیا آباد کر لیتے ہیں۔ بقول پروفیسر احتشام حسین:

اختر شیرانی کا عشق افلاطونی اور جنسی محبت دونوں کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔اس کی ابتدا تو جنسی اور جسمانی محبت سے ہوتی ہے لیکن اس کی معراج تخیلی محبت ہے۔ محبوبہ سے زیادہ محبت کا خیال آتا ہے۔ جہاں مشوقہ نہیں عشق سب کچھ بن جاتا ہے۔[۶۰]

آہ او سلمیٰ و ہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے
وہ ملاقاتیں وہ باتیں یاد آتی ہیں مجھے
حسن و الفت کی وہ گھاتیں یاد آتی ہیں مجھے
وہ وہ راتیں ،وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے[۶۱]

نظم " شبہائے رفتہ " کا یہ ایک بند احتشام حسین کی اس بات سے ملتا جلتا ہے۔اختر محبت میں اپنے سماج کی حدود کو پار نہیں کرتا۔وہ سلمیٰ کے ساتھ چند لمحے گزار کر پھر اس کی یاد میں وقت گزارتا ہے۔اس کے حسن،اس کی محبت اور اس کی باتوں کو ایک یاد میں لپیٹ کر اس کے سہارے جیتا ہے کیوں کہ وہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کی دیواروں کو پلانگے۔اختر کو گجرات کی سرزمین سے محبت تھی کی کیوں کہ یہ اس کی محبوبہ سلمیٰ کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ جب اس کے سامنے گجرات کا ذکر چھیڑا جاتا تو احترام سے اس کا سر جھک جاتا۔ وہ گجرات کا عاشق تھا اور ان کی نظموں میں سلمیٰ کے ساتھ ساتھ گجرات کا ذکر تواتر سے ملتا ہے۔مثال کے طور پر آپ فرماتے ہیں۔

اے سرزمین گجرات،اے خلدزا ر الفت
پھولوں میں تیرے رقصاں، روح بہار االفت!
تیرا ہر اک ذرہ راز دار الفت!
اور یادگار الفت!
اے سرزمین گجرات![۶۲]

پھر آرزو کو رسوا کرنے کی آرزو ہے
رونے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے
سلمیٰ کے قدموں پر سر دھرنے کی آرزو ہے

مرنے کی آرزو ہے!

اے سرزمین گجرات![۱۳]

اختر کا کلام گجرات اور سلمیٰ کے ذکر سے بھرا ہوا ہے۔ گجرات میں اختر و سلمیٰ کے ملاقاتوں کا سلسلہ رواں دواں تھا۔ وہ اپنی نظم "گجرات کی رات میں لکھتے ہیں:

آج قسمت سے نظر آئی ہے برسات کی رات
کیا بگڑ جائے گا رہ جاؤ یہی رات کی رات
ان کی پابوسی کو جائے تو صبا کہہ دینا
آج تک یاد ہے وہ آپ کے گجرات کی رات
جس میں سلمیٰ کے تصور کے ہیں تارے روشن
میری آنکھوں میں ہے وہ عالم جذبات کی رات[۱۴]

اختر سلمیٰ سے ملاقات کی رات اور حسین لمحوں کو فراموش نہیں کر سکا اور اپنی نظموں میں جگہ جگہ اس کا ذکر کیا۔ ملن کی اس رات کو برسات کی رات جیسی خوب صورت رات سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ برسات میں چلنے والی حسین اور تازہ ہوا کو سلمیٰ کی خدمت کے لیے بھیجا ہے مگر ساتھ یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ سلمیٰ کو اس رات کی یاد دہانی کرا و کہ جب ہم اس تاروں بھری رات میں ساتھ تھے۔ یہاں یہ بات بھی سامنے لانا ضروری ہے کہ اختر اور سلمیٰ کی ملاقاتیں ہوس اور آلودگیوں سے عاری تھی اور یہ ملاقاتیں ایک حد تک معصومانہ تھیں۔ انہوں نے عشق و محبت کے معاملات میں اپنی تہذیب ک چار دیواری سے قدم باہر نہیں رکھا۔

اختر کا دل بازاری دنیا اور بناوٹی لوگوں سے اچاٹ تھا۔ اس لیے انہوں نے اس دنیا سے دور اپنے لیے ایک ایسے جہاں کی تعمیر کی جہاں پھول ہی پھول اور ہر طرف بہاریں اور روشنیاں تھیں۔ جہاں اس کی محبوبائیں اور اس کا عشق پورے زوروں پر تھا۔ وہ جس دنیا میں جانا چاہتا ہے وہ اس کا اظہار یوں کرتا ہے:

آنکھوں میں سمائی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا
جنت کی طرح رنگین شاداب نما دنیا

اللہ وہی لے چل

اے عشق کہیں لے چل[۶۵]

اختر شیرانی عشق و محبت کا شاعر ہے وہ اس دنیا سے کہیں دور جانا چاہتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی آرزو کرتا ہے کہ اسے اس پر نور اور جنت بھری وادی میں لے جائے جہاں سکون ہی سکون ہے۔

اک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں

یہ مکرو جفا حیوان پیشہ نہ بستے ہوں

انسان کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہوں

توخوف نہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل[۶۶]

وہ ایک رومانی کی طرح اس پاپ بھری دنیا سے دور جانا چاہتے ہیں کیوں کہ جب وہ اپنے ارد گرد گناہوں اور برائیوں کا بازار گرم دیکھتے ہیں تو اس کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ان شیطانوں اور حیوانوں کے مسکن سے اپنی الگ جہاں میں جانے کے خواہاں ہیں۔

مجموعی جائزہ:

مجموعی طور پر اختر کی زیادہ تر نظمیں رومانی ہیں لیکن رومان کے پردے میں انہوں نے معاشرے کے سماجی رویوں اور سماج کے افراد کے تعلقات کو واضح کیا ہے۔ آپ رومانیت کے ساتھ حقیقت پسندی سے بھی نظریں نہیں چراتے۔ انہوں نے رومانی نظموں میں سماج سے جڑے حالات و واقعات کی عکاسی بڑی خوب صورتی سے کی ہے۔ سماج میں موجود اچھائیوں کو سراہتے ہیں اور برائیوں پر نظر ڈال کر ان کو برا کہتے ہیں۔ ان برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سماجی تعلقات کی بہتری کی کوشش کرتے ہیں اور سماجی اصطلاح چاہتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا خلوص نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اختر شیرانی نے عشق و محبت جیسے جذبے کو ایک انوکھے اور منفرد انداز میں بھرتا ہے۔ ان کا یہ انداز انہیں دوسرے رومانی فنکاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اختر کی نظمیں ان کی زندگی کی تشریح و تفسیر ہے۔ اپنے زمانے اور عہد کے تقریباً ہر رجحان کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ ان کی نظمیں ذاتی زندگی کے علاوہ ان کے عہد کے حالات کی ترجمان ہیں۔

اخترنے شاعری کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی ان کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ نظم میں ہیت کے نئے تجربے کیے۔ رومانی تحریک کے اہم رکن کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ اس وقت ان کی مقبولیت کا ستارہ چمکا جب اقبال جیسے بڑے شاعر اپنی قابلیت کی بنا پر دنیا بھر میں شہرت حاصل کر رہے تھے۔ اتنے بڑے شاعرت کی موجودگی میں شہرت حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ مختصر یہ کہ اخترنے اپنے منفرد کلام سے اردو شاعری کو بڑی حد تک متاثر کیا۔

حوالہ جات

۱۔ یونس حسنی،اختر شیرانی اور جدید اردو ادب(کراچی:پرنٹرز و پبلشرز ۲۰۰۹ء)،ص ۲۴۷۔

۲۔ احمد ایس پٹیل، غلام ابرابر صدیقی،سماجی زندگی(دہلی: مطبوعہ نعمانی برقی پریس،۱۹۵۱ء)،ص ۷۔

۳۔ عبدالقادر عمادی،سماج اور تعلیم (دہلی:راکیس پریس،۱۹۷۷ء۔۱۸۹۹ء)،ص ۳۵۔

۴۔ عبادت بریلوی،تنقیدی زوایے(لاہور:انشا پریس،۱۹۵۱ء)،ص ۲۳۔

۵۔ ایضاً،ص ۹۔

۶۔ یونس حسنی(مرتب)کلیات اختر شیرانی (لاہور:پرنٹ یارڈ پرنٹرز،۲۰۰۹ء)،ص ۱۰۵۷۔

۷۔ غلام حیدر،میرے استاد (دہلی:لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاوس،۲۰۰۹ء)،ص ۵۔

۸۔ یونس حسنی(مرتب) کلیات اختر شیرانی،ص ۷۶۔

۹۔ یونس حسنی(مرتب)نغمہ حرم (لاہور:بک پرنٹرز،۱۹۹۳ء)،ص ۷۶۔

۱۰۔ یونس حسنی(مرتب)کلیات اختر شیرانی،ص ۹۱۴۔

۱۱۔ ایضاً،ص ۷۴۷۔

۱۲۔ ایضاً،ص ۷۴۸۔

۱۳۔ ایضاً،ص ۷۸۵۔

۱۴۔ ایضاً،ص ۷۸۶۔

۱۵۔ ایضاً،ص ۷۸۴۔

۱۶۔ جلیس عابد(مترجم)،لینن اور کسان (دہلی:یونین پرنٹنگ،۱۹۷۰ء)،ص ۱۔

۱۷۔ یونس حسنی،اختر شیرانی اور جدید اردو ادب،ص ۶۵۰۔

۱۸۔ یونس حسنی(مرتب)کلیات اختر شیرانی،ص ۳۱۔

۱۹۔ یونس حسنی(مرتب)پھولوں کے گیت (لاہور:بک پرنٹرز،۱۹۹۳ء)،ص ۸۴۔

۲۰۔ یونس حسنی(مرتب)کلیات اختر شیرانی،ص ۱۰۵۵۔

۲۱۔ ایضاً،ص ۶۵۔

۲۲۔ ایضاً،ص ۱۹۶۔

۲۳۔ ایضاً،ص ۱۹۹۔

۲۴۔ میر ولی الدین صاحب، رموز عشق، (دہلی: نیو لیتھو آٹ پریس، ۱۹۸۱ء)، ص ۱۳۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۲۶۔ یونس حسنی، اختر شیرانی اور جدید اردو ادب، ص ۱۴۴۔

۲۷۔ احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید (لکھنؤ: سرفراز قومی پریس لکھنو، ۱۹۶۱ء)، ص ۲۳۰۔

۲۸۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۴ء)، ص ۵۵۶۔

۲۹۔ نیر واسطی، سلمی سے دل لگا کر (دہلی: موڈران پبلشنگ ہاوس، ۱۹۸۰ء)، ص ۹۔

۳۰۔ یونس حسنی، اختر شیرانی اور جدید اردو ادب، ص ۲۴۰۔

۳۱۔ عبادت بریلوی، جدید شاعری (لاہور: اشرف پریس، ۱۹۶۱ء)، ص ۵۴۴۔

۳۲۔ یونس حسنی (مرتب) نغمہ حرم، ص ۱۳۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۳۴۔ غلام دستگیر رشید، اسلامی تہذیب کیا ہے؟ (لاہور: اتحاد پریس، ۱۹۴۹ء)، ص ۲۶۔

۳۵۔ یونس حسنی (مرتب) کلیات اختر شیرانی، ص ۱۰۴۱۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۰۴۰۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۷۲۹۔

۳۸۔ اسماعیل آزاد فتح پوری، اردو شاعری میں نعت ابتدا سے محسن تک (لکھنو: نسیم بک ڈپو، ۱۹۹۲ء)، ص ۴۷۔

۳۹۔ یونس حسنی (مرتب) شہرود (لاہور: بک پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۹۔

۴۰۔ یونس حسنی (مرتب) اخترستان (لاہور: بک پرنٹر ۱۹۹۳ء)، ص ۱۰۷۔

۴۱۔ یونس حسنی (مرتب) کلیات اختر شیرانی، ص ۸۳۵۔

۴۲۔ محمد واصل عثمانی، ماں (دہلی: عاکف بک ڈپو، ۱۹۹۰ء)، ص ۹۷۔

۴۳۔ یونس حسنی (مرتب) نغمہ حرم، ص ۳۳۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۲۲۔

۴۸۔ احتشام حسین،تنقید اور عملی تنقید(لکھنو:اترپردیش اردواکادمی،۲۰۰۵ء)،ص۱۹۸۔

۴۹۔ مجنوں گورکھپوری،ادب اور زندگی(علی گڑھ:اردوگھر،۱۹۸۴ء)،ص۴۸۔

۵۰۔ یونس حسنی(مرتب)اختر ستان،ص۸۸۔

۵۱۔ یونس حسنی(مرتب)نغمہ حرم ،ص۱۸۔

۵۲۔ یونس حسنی(مرتب)کلیات اخترشیرانی،ص۳۵۶۔

۵۳۔ ایس اخترجعفری،اختر شیرانی اور اس کی شاعری(لاہور:اشرف پریس،۱۹۶۴ء)، ص۷۔

۵۴۔ یونس حسنی(مرتب)نغمہ حرم ،ص۸۷۔

۵۵۔ ایضاً،ص۸۸۔

۵۶۔ ایضاً،ص۴۷

۵۷۔ یونس حسنی(مرتب)اخترستان،ص۶۰۔

۵۸۔ ابواللیث صدیقی، تجربے اورروایت (کراچی:ایجوکیشنل پریس،۱۹۵۹ء)،ص۱۷۴۔

۵۹۔ یونس حسنی(مرتب)اخترستان،ص۶۰۔

۶۰۔ احتشام حسین،تنقید اور عملی تنقید،ص۲۲۵۔

۶۱۔ یونس حسنی(مرتب)شہناز،ص۵۶۔

۶۲۔ یونس حسنی(مرتب)کلیات اخترشیرانی،ص۱۰۶۔

۶۳۔ ایضاً،ص۱۱۱۔

۶۴۔ ایضاً،ص۷۹۔

۶۵۔ ایضاً،ص۸۳۔

۶۶۔ ایضاً،ص۸۵۔

باب سوم:

اختر شیرانی کی نظموں میں رسم ورواج اور تاریخ کا جائزہ

مسلمان جب ہندستان میں ایک فتح مند قوم کی حیثیت سے وارد ہوئے تو ان کے آنے کچھ مسئلے انھیں پیش آئے۔ کیوں کہ مسلمان حکومت کرنے کی عرض سے آئے تھے اور دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے ساتھ ایک ایسا مذہب لے آئے تھے۔ جو مفتوح کے مذاہب سے بالکل مختلف تھا۔ ان دونوں قوموں کی زبان اور مذاہب کی وجہ سے آپس میں شدید اختلاف تھا اور اس وجہ سے یہ قومیں آپس میں سوائے نفرت کے کچھ نہیں بانٹ رہی تھیں۔ مسلمان چوں کہ فاتح قوم کی حیثیت سے آئے تھے۔ اس لیے انہیں یہ علم تھا کہ رعایا کی مدد کے بغیر حکومت کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے وہ ہندوؤں سے نرمی سے پیش آنے لگے۔ اگرچہ مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کا وہ جوش وخروش نہیں دکھائی دے رہا تھا جو خلفائے راشدین کے مسلمانوں میں تھا۔ ابتدائی دور کے علمائے کرام نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں باشاہ اور امراء سے مدد مانگی تو انہوں نے ان کی کوئی خاص مدد نہیں کی لیکن انہیں اس سلسلے میں ناکامی دیکھنی پڑی۔ سلطان التمش جیسے متقی صوفی اور مذہبی مسلمان نے بھی اس حوالے سے ان کا ساتھ نہ دیا۔ اگر مسلم صلاطین ہندوؤں پر زور اور دباؤ ڈالتے تو ان کے دل مسلمانوں کی نفرت اور بعض کے جذبات سے بھر جاتے اور مسلم حکمران اپنی رعایا کی تعاون سے محروم ہو جاتے۔ بقول ڈاکٹر محمد عمر:

> قرآن اپنے متبعین کو جہاں بلند اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ وہیں اعلیٰ ظرفی کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کے ساتھ رواداری کا برتاو کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ یہ معاشرہ امن وسکون اور عدل وسلامتی کا گہوارہ بن جائے۔[1]

جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ارشاد ہے کہ اگر مشرک لوگ مسلمانوں سے مدد مانگے تو ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ آخری نبی حضرت محمد کی سیرت مبارک سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے کبھی کسی پر زور زبردستی نہیں کی بلکہ سب کے ساتھ اچھا برتاو کیا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جب مسلم فاتح ہندوستان آئے تو انہوں نے یہی طریقہ کار اپنایا جس کے باعث رفتہ رفتہ ہندو اسلام کے مرکز میں آنے لگے۔

آہستہ آہستہ ہندو اور مسلمان ساتھ رہنے لگے۔ اس طرح انہوں نے ایک دوسرے کے عادات واطوار، زبان، خیالات اور رسوم ورواج کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان میں بھائی چارے کا سلوک رواج پایا۔ ہندو سماج چار حصوں

میں تقسیم تھا۔ برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔ شودر قوم کو نچلا طبقہ سمجھا جاتا تھا اور ہر قسم کی آسائشیں اور بنیادی حقوق سے محروم تھا۔ ان پر اتنی پابندیاں عائد تھیں کہ وہ ان سے جان چھڑانے کے لیے مضطرب تھا۔ اس وقت جنوبی ہندوستان میں ذہنی انقلاب شروع ہوا اور اس سے یہ مثبت اثرات مرتب ہوئے کہ ذات پات کی تفریق ختم ہوئی۔ ولبھ چاریہ، رامانج اور شنکر چاریہ نے اس ضمن میں بہت کوششیں کیں۔ ان کا مقصد تھا کہ ہندو قوم میں ہر فرد کو سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی حقوق دیے جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ شمالی ہندوستان میں فاتح مسلمان قوم کے ساتھ اسلام بھی اس خطہ زمین پر پہنچا۔

ہندوؤں کے کئی خدا تھے جن کی وجہ سے ان میں کوئی اتفاق نہ تھا۔ ان کے دلوں میں یہ بات بٹھائی جاتی تھی کہ اگر ان کے مذہبی رسوم برہمن کے بغیر ادا کیے جائے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس وجہ سے گوتم بدھ اور مہابیر نے ویدک دھرم سے اختلاف کیا اور اپنا ایک جداگانہ مسلک چلایا۔ جس میں ہر فرد کو اپنے ذرائع استعمال کرنے کی آزادی تھی۔ جب کہ اسلام ایک ایسا مکمل مذہب تھا جس میں صرف ایک خدا کو مانا جاتا تھا۔ نہ ظاہری رسوم تھے نہ کوئی تفریق۔ اسلام جیسے مذہب میں کسی بھی انسان کی اجارہ داری نہ تھی۔ یہ اتنا دلکش مذہب تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں ہندو بلا کسی دباؤ اور ظلم کے اس دائرے میں داخل ہوئے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ہندو مسلم کے درمیان نفرت نے محبت اور بھائی چارے کی جگہ لے لی۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہندوستان کے اکبر بادشاہ نے ہندو مسلم کو رشتہ یگانت میں باندھنے کی کوشش کی انہوں نے ہندو مسلم حتی کہ ہندستانی رعایا میں سماجی مذہبی اختلاف کو نظر انداز کر کے تمام لوگوں کے لیے سرکاری نوکریاں کیں۔ اگرچہ مسلم صوفیائے کرام اور ہندو سادھو نے مسلمان اور ہندوؤں کو آپس میں میل جول اور دوستی رکھنے میں اہم کردار ادا کیا لیکن یہاں بادشاہ اکبر کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس ضمن میں محمد احمد فلاحی رقم طراز ہیں:

> اکبر بادشاہ نے ان تمام پابندیوں کو ختم کر دیا جو مذہبی اختلافات کی بنا پر ہندوؤں کو شہریت کے بعض حقوق سے محروم کرنے والی ہو سکتی تھیں۔ مثلاً جزیہ معاف کر دیا گیا۔ نئے مندر تعمیر کرانے اور بلا کسی مزاحمت کے مذہبی رسوم ادا کرنے کی عام اجازت دے دی گئی اور اس طرح رعایا کو ایک شہری کے حقوق سے سرفراز کیا گیا۔[۲]

انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنے اپنے رسوم کی ادائیگی کے لیے آزادی دی۔ ایک محل میں آذان اور ناقوس دونوں کی صدائیں گونجتی تھیں کیوں کہ ان کے ہاں ہندو و مسلم دونوں موجود تھے۔ اسی طرح دونوں

رسموں کے میل ملاپ سے ان کے رسم ورواج آپس میں گھل مل گئے جو آج تک کسی نہ کسی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

لمبے عرصے سے ہندو اور مسلمان ایک ساتھ رہ رہے تھے جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے سماجی مذہبی سیاسی اور ذہنی معاملات میں رضامندی اور خوشی سے شریک ہوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں، شادی بیاہ کی محفلوں میں بڑی محبت سے اٹھتے بیٹھتے تھے۔ تاریخ سے یہ بات عیاں ہے کہ بہت سے ہندو افراد نے اس وجہ سے اسلام قبول کیا نہ صرف خوشی بلکہ مصیبت اور تکالیف کے وقت بھی ایک دوسرے کی ڈھال بنتے تھے۔ جیسے اردو ادب کے شاعر غلام ہمدانی مصحفی پر مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور روہیلوں نے تکالیف اور مشکلیں بڑھائیں تو اس عالم میں مصحفی نے لکھنو میں لالہ کانجی مل کے ہاں پناہ لی اور انہوں نے ان کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں کی۔ اسی طرح راجہ جگل کشور نے میر کا بہت خیال رکھا۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لال برج لال، مرزا مظہر جان جاناں کے پرانے دوست تھے مظہر جان جاناں نے ان کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ یہاں تک کہ لالہ برج لال کو ملازمت دلوانے کے لیے ایک مسلمان امیر کو سفارش کے طور پر خط لکھا۔ کئی مسلمان شعرا نے ہندو شعرا کے بارے میں خوب صورت اقوال بھی لکھے جیسے مصحفی نے راجہ جسونت سنگھ کو جوان اور ذی شعور کہا ہے۔ ان سب تعلقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان رسم ورواج پر ایک دوسرے کا اثر پختہ ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے صرف نام کا فرق رہ گیا۔

فطرت میں کئی تبدیلیاں آتی ہیں اور آنے والے وقت میں آتی رہیں گی۔ چاند، سورج، زمین، دریا، پہاڑ، صحرا اور وادیاں فطرت ہی کی پیداوار ہیں لیکن ان سب میں سب سے بڑا انقلاب اس وقت ظہور پذیر ہوا جب انسان نے تہذیب تمدن کی طرف خود کو بڑایا۔ پہلے انسان مہذب نہ تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی میں نظم ضبط پیدا کرتا گیا۔ یہ سب ایک جست میں طے نہیں ہوا بلکہ اس میں کئی صدیاں لگیں۔ انسان نئے نئے رسوم ورواج سے روشناس ہوتا گیا اور وقت کے ساتھ ہر عہد میں ان میں مختلف ردوبدل بھی کرتا رہا۔

اختر شیرانی کی نظموں میں رسم ورواج کی عکاسی:

ادب اور انسان کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ جس وقت انسان اس دنیا میں وارد ہوا تو اس نے ادب کو تخلیق کرنا بھی شروع کیا۔ پہلے انسان نے ترقی نہیں کی تھی جس کی بدولت وہ پتھروں اور پتوں پر لکھتا تھا۔ پھر کاغذ اور کپڑے پر لکھا گیا۔ ادب میں نہ صرف ادیب نے اپنے احساسات اور جذبات کو موضوع بنایا بلکہ اپنے عہد کی تصویریں بھی پیش کرتا رہا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر عہد کی تہذیب کتاب کے صفحوں میں محفوظ ہوتی گئی۔ اردو ادب میں چاہے نثر ہو یا شاعری

دونوں نے اپنی تہذیبی روایات کو اپنے اندر سمو لیا۔ طویل داستانیں محض وقت گزاری کے لیے دیکھی جاتی تھیں یا پھر اپنے وقت کے عوام کے شوق کے تقاضے کے طور پر لیکن دوسری طرف وہ طویل داستانیں اپنے عہد کے سماجی، سیاسی ،مذہبی اور معاشرتی حالات کے مرقعے بھی سامنے لاتی تھیں۔اس حوالے سے اردو ادب کی مشہور داستانیں باغ و بہار اور فسانہ عجائب اہمیت کی حامل داستانیں ہیں۔ ''سحر البیان'' اور ''گلزار نسیم'' جیسی مثنویاں بھی اسی دائرے میں آتی ہیں۔

اردو نظم میں ہر عہد کے شاعر نے اپنے زمانے کے رسم و رواج پر روشنی ڈالی ہے۔اختر شیرانی کا نام سنتے ہی قاری کے ذہن سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ کی گنی زلفوں اور شبنمی عارضوں میں الجھ جاتا ہے لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو زندگی صرف رومان کا نام نہیں زندہ رہنے کے لیے انسان کو اور چیزوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔اختر اس معاشرے کا ایک سانس لیتا ہوا انسان تھا اور اس دنیا کے رسم و رواج سے آشنا بھی تھا۔ شادی اسلام کا ایک اہم عنصر ہے اور اس کے لیے اسلام نے بہت سادہ شرائط رکھے ہیں ہر دور میں اس کی ادائیگی کے لیے مختلف مراحل ہوتے تھے۔ کوئی اس میں بہت سی رسموں کا اہتمام کرتا تھا جس میں ہندو کے بعض رسموں کا میل ملاپ ہو جاتا اور کچھ لوگ باقاعدہ اسلامی طور طریقوں کو اپناتے تھے۔جب حضرت فاطمہ کا نکاح ہوا تو بہت سادگی بھرتی گئی۔اس طرح حضرت عائشہ کی شادی کی رسم سادگی سے ادا کی گئی جس میں اسراف نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

> گھر کا سامان یہ تھا ایک چارپائی ایک چٹائی ایک بستر ایک تکیہ اور کھجور رکھنے کے دو مٹکے پانی رکھنے کا ایک برتن پانی پینے کا پیالہ باقی خیریت خیر صلہ۔[۳]

شادی اگر اسی انداز میں سادگی سے کی جائے اور مسلمان خود کو دوسروں کی اندھی تقلید سے محفوظ رکھیں تو ایسے میں کامیابی ان کے قدم چھومے گی اور جو لوگ اس کے برعکس کام اپناتے ہیں تو زلالت اور ناکامی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ حیدر آباد میں واقعہ پیش آیا کہ لڑکی کے باپ کی معقول تنخواہ تھی۔ لیکن اس نے شادی کی اتنی فضول تیاریاں کیں اتنے فضول رسم بڑھائے کہ اس کے لیے قرض پہ قرض کرتا گیا۔ شادی ہونی تھی ہو گئی لیکن محض تین مہینے میں قرض کا بوجھ لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہندوستان میں چاہے ہندو ہو یا مسلمان عورت کی شادی پر جب وہ میکے سے رخصت ہوتی ہے عورت کو ماں باپ اور دوسرے عزیز اقارب مختلف دعاوں سے نوازتے ہیں اختر اپنی نظم ''ایک عزیزہ کی شادی پر'' اسے مختلف دعاؤں سے نواز رہا ہے۔اس نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

بہشت نو کی فضائیں تمہیں مبارک ہوں !
مسرتوں کی گھٹائیں تمہیں مبارک ہوں!
نسیم گل کی طرح مشکبار بن کے رہو!

ستانے پائیں نہ افکار اس جہاں کے تمہیں !
کریں ملول نہ آزار آسماں کے تمہیں !
نزیل سایہ پروردگار بن کے رہو ! [۴]

ایک عزیزہ کو منفرد الفاظ کے ذریعے ایک لازوال دعا سے نوازا ہے۔ عورت کے لیے اس کا نیا گھر ایک جنت قرار دیتے ہیں کہ اس جنت کی ساری خوشیاں تمہیں راس آئے یہاں عورت کو ایک خوب صورت خوشبو کے باعث صبح چلنے والی ٹھنڈی اور تازہ ہوا سے تشبیہ دی ہے۔ یہاں اختر کا فنی کمال بھی عروج پر ہے۔ وہ عورت کے لیے دعا گو ہے کہ تم اپنے اگلے گھر میں جا کر اس خوشبو دار ہوا کی مانند پھیل جاو کہ ہر چیز اس خوشبو سے لطف اندوز ہو جائے۔ یہاں اختر کا مراد عورت کے اچھے اخلاق اور نیک ارادوں کی طرف ہے۔ اختر مزید کہتا ہے کہ کوئی دکھ اور پریشانی تمہارا مقدر نہ بنے نہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔ یہاں استعارے کا استعمال کلام کو اور بھی خوبصورت بنا رہا ہے ایسے استعارات ان کی شاعری کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی فکری سوچ کو بھی ابھارتے ہیں ''نزیل سایہ پروردگار'' میں ایک وسیع مفہوم پوشیدہ ہے اور ان الفاظ میں اس دعا کا نچوڑ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی عزیزہ خاتون کو اس گھر میں بھی بطور مہمان کا درجہ دیتا ہے کہ تم ہو اس مسافر کی مانند ایسی زندگی بسر کرو جہاں تم سے جڑے لوگ تمہیں اللہ کا ایک قیمتی تحفہ سمجھے۔

اختر شیرانی نے ''ایک عزیزہ کی شادی پر سسرال جاتے ہوئے دعا'' کے عنوان سے دو نظمیں لکھی ہیں ۔ایک نظم ان کے شعری مجموعے شہرود میں ہے اور دوسری نظم نغمہ حرم میں ہے۔ ان نظموں کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شاعر ایک خاتون کو اس کی شادی کے وقت مختلف دعاؤں سے نواز رہا ہے اور یہ ہی اس دنیا کا دستور ہے خاص طور پر ہندستانی شادیوں میں یہ رسم شروع سے اب تک رہی ہے کہ لڑکی کو اس کے ماں باپ اور عزیز و اقارب دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ نظمیں اختر نے اپنی رشتے دار خواتین کی شادی پر لکھی ہیں کیوں کہ ان نظموں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہیں کہ یہ محض اس کا خیال نہیں تھا بلکہ حقیقی زندگی کے لمحے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ :

نئے عزیز تمہیں رحمت خدا سمجھے
تمہارے سایہ کو بھی سایہ ہما سمجھے
سحاب فضل خدائے غفور بن کے رہو! [۵]

ہندستانی معاشرے کا دستور ہے کہ جب عورت اپنے بابل سے رخصت ہوتی ہے تو سسرال کا گھرانہ اس سے بہت سی امیدیں اور آس لگائے ہوتا ہے اور جب عورت وہاں جا کر اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھائے تو اس سے نہ صرف وہ گھرانہ بلکہ عورت کی ذات مکمل ہو جاتی ہے۔ یہاں اختر نے لفظ ''ہما'' کا استعمال کر کے اس بات کی وضاحت کی ہے اور عورت سے مخاطب ہے کہ تو اپنی ذات سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچاو کہ وہ پرائے لوگ تمہاری خدمت اور توجہ سے خود کو کامیاب و کامران پائے اور اگر تمہارے ارد گرد کے لوگ بھول سے بھی غلطی کرے یا تمہیں تکلیف پہنچائے تو نرمی سے پیش آسکو۔ یہاں اختر شیرانی عورت سے اظہار محبت اور دعا کا رشتہ قائم کرتے ہوئے اس کی ذات کی اہمیت کو ابھار رہا ہے۔

اختر رومانی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب اسلام کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''پردہ'' اسلام جیسے شفاف مذہب کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ شروع ہی سے مسلمانوں میں رواج پایا گیا۔ بعد میں جب مسلمان حملہ آور ہندستان میں وارد ہوئے تو تعداد میں قلیل تھے اور دشمن کی جماعت کثیر تعداد میں تھی جن کے درمیان ان کو رہنا پڑا۔ جب وہ جنگ کے لیے جاتے وہ اپنی عورتوں کو اکیلا چھوڑتے تھے چنانچہ ان کو اس مسئلے کا واحد حل یہ نظر آیا کہ وہ اپنی عورتوں کو پردے میں رکھے اور اس طرح آہستہ آہستہ پردے کا رواج بنتا گیا۔ نتیجے میں پردے سے مثبت اثرات مرتب ہونے لگے اور بہت سی خرابیاں اچھائیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہمارا مذہب اسلام اس بات کا حکم دیتا ہے کہ مسلمان عورت کے لیے نامحرم سے پردہ جائز اور ضروری ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظموں میں پردے کے حوالے سے کئی نظموں پر زور قلم اور اپنا فکری سرمایہ صرف کیا ہے۔ اس موضوع پر کئی صحابہ نے احادیث لکھی ہیں۔ جس کی مدد سے آنے والی نسلوں نے اس چیز کو رواج دیا۔

اختر کی بعض نظمیں اس بات کی دلیل پیش کرتی ہیں کہ پردہ عورتوں کے لیے لازم ہے۔ اختر ہندوستانی معاشرے کا ایک باشندہ تھا اور ہندوستان میں عورت پردے میں ہوتی تھی۔ ان کے خیال میں عورت کا پردہ اس کے حسن کا باعث بنتا ہے۔

ڈاکٹر یونس حسنی اپنی کتاب ''اختر شیرانی اور جدید اردو ادب'' میں رقمطراز ہیں کہ

''اختر عورت کو پردے میں رکھنا چاہتے ہیں۔''[۶]

پردے کے حوالے سے اختر کا استدلال ملاحظہ ہو:

حسن فطرت ہے گلستان کی بہاروں میں نہاں
نغمہ روح فزا ساز کے تاروں میں نہاں
لعل پنہاں ہے اگر کان کے گنجینے میں

برق رکشاں ہے نہاں ابر کے آئینے میں
جب ہر اک طرفہ لطافت ہے نہاں پردے میں
پھر برا کیا ہے جو عورت ہے نہاں پردے میں [۷]

عورت کو پردہ حسن کی دولت سے مالامال کرتا ہے۔ یہاں اختر کا رومانی طرز فکر نمایاں ہے اس کائنات میں جہاں جہاں حسن ہے وہ انسانی آنکھ سے پوشیدہ ہے۔ سب سے بڑھ کر تو اس خدا کا حسن ہے جو بہت سے پردوں میں نہاں ہے۔ اس دنیا کے جاندار و بے جان چیزوں سے او جھل ہے۔ اگر کائنات کی ہر حسین و جمیل شے پردوں میں چھپا ہوا ہے تو پھر عورت کیوں خود کو یا اپنے جلوؤں کو ارزاں کریں۔ اسے بھی خود کو چھپانا چاہیے کیوں کہ یہ فطرت کا اصول بھی ہے کہ عورت اپنے آپ کو چھپائے اور اس معاشرے کا رواج بھی۔

اتر شیرانی نے اپنے معاشرے کے رسم و رواج کو بڑی باریک بینی سے محسوس کیا اور اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ ''شب برات'' جیسے مقدس موضوع پر کئی نظمیں لکھی ہیں وہ کہتے ہیں:

لیے ہجوم تجلی شب برات آئی!
ہزار ماہ فدا جس پہ ہوں وہ رات آئی!
یہ رات آئی ہے کہ آیا ہے سعادتوں کا ہجوم!
کہ بام عرش سے موج تجلیاں آئی! [۸]

شب فارسی میں رات کو کہتے ہیں برات عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں بری ہونا، آزاد ہونا۔ شب برأت پندرہ شعبان کی وہ رات ہے جس میں آخری نبی حضرت محمدؐ جنت البقیع میں پہنچے تھے۔ آپؐ نے حضرت عائشہ سے یہ فرمایا کہ یہ بخشش کی رات ہے اور اسی رات میں اللہ تعالیٰ بنو قلب قبیلے کی بھیڑ بکریوں کے بال برابر گناہ معاف کرتا ہے اور اپنے بندوں کی مغفرت کرتا ہے۔ یہ رات وہ رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ انسان کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

پھر ایک سال میں جا کر شب برات آئی
مزے مزے کی نئی ،پیاری پیاری رات آئی
شریر لڑکے مچاتے ہیں شور گلیوں میں
ہر ایک محو ہے شعلوں کی رنگ رلیوں میں
نکل کے گھر سے پٹاخے چلا رہا ہے کوئی

جلا کے ہات میں مہتاب لارہا ہے کوئی
گھروں میں عورتیں حلوا پکارہی ہیں کہیں
کھلا رہی ہیں کہیں اور کھا رہی ہیں کہیں [9]

شب برات کے حوالے سے تہوار یا جشن کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ایسی کوئی مستند کتاب سامنے نہیں آئی جس میں اس تہوار کو اسلامی قرار دیا گیا ہو۔اس رات میں لوگ آتش بازیاں اور کھیل تماشے کرتے ہیں جس کے لیے علمانے ممانعت کی ہے۔چوں کہ مسلمان لمبے عرصے تک ہندووں کے ساتھ اکھٹے رہیں تو ان پر ہندووں کے اثرات نمایاں ہوں گئے ۔ہندووں کی رسم کناگت اور شب برات میں بہت زیادہ مماثلت سامنے آتی ہیں۔ کناگت میں ہندوؤں مردوں کی فاتحہ کیلئے حلوہ پوری پکانا ضروری سمجھتے ہیں۔اختر نے ان کا ذکر کیا ہے کیوں کہ وہ اسی ہندوستانی معاشرے کے پرورردہ تھے لیکن نظم کے آخر میں اس مقدس رات پر فضول رسموں کی ممانعت کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔

فضول آگ کا یہ کھیل اچھی بات نہیں
شب برات ہے یہ ایسی ویسی رات نہیں [10]

اختر نے اس رات کی اہمیت کو بڑی چابک دستی کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس رات ہونے والی فضول رسموں کی نفی کرتے ہیں جو ہندووں کی بدولت مسلمانوں نے رواج دی۔بقول ارشد مینا نگری:

> عید کے ساتھ لفظ فطرت جڑا ہوا ہے جس کے معنی شروع کرنے کے ہیں۔اسی سے فطرہ ماخوز ہے۔اس کے معنی شرکت کے ہیں اس کا اطلاق افطار یا روزہ کھولنے پر ہوتا ہے۔[11]

جو شخص روزہ رکھتا ہے اور پھر اسے کھولتا ہے تو وہ فطرت کے تقاضے کو پورا کرتا ہے اور اپنی فطری حالت کی طرف لوٹتا ہے۔اسی طرح عید کو عیدالفطر کیا جاتا ہے یہ مذہبی تہوار رمضان کے مہینے کے بعد پہلی شوال کو زور و شور سے منائی جاتی ہے اور رمضان کے روزوں کی تکمیل کے نتیجہ میں ادا کی جاتی ہے۔ عید کا دن دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے خوشی اور مسرت کا دن ہوتا ہے۔ شہروں اور دیہاتوں میں اس دوران مختلف میلے ٹھیلے اور متنوع تقاریب منعقد ہوئے ہیں۔اس تہوار میں غریبوں کو زکوۃ دی جاتی ہے۔ہر صاحب حیثیت شخص اپنی طاقت کے مطابق مسکینوں کی امداد کرتا ہے۔اردو ادب کے ہر شاعر نے مسلمانوں کی اس مقدس تہوار پہ طبع آزمائی کی ہیں۔اختر شیرانی عید کے چاند نظر آنے پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔

الٰہی تیرا ہزار شکر آج پھر خوشی کا زمانہ آیا
ہلال عید اک برس کے بعد آج تونے پھر دکھایا
ہر ایک زرے پہ ہو رہا ہے محیط تیرے کرم کا سایہ
خوشی سے ہے محو حمد دنیا میں آج ہر اپنا اور پرایا[۱۲]

یہاں سلیس انداز میں عید کے چاند کا منظر بیان کیا گیا ہے کہ عید کے چاند کا منظر اتنا دلکش ہوتا ہے کہ وہاں موجود دنیا کی ہر شے پر اس پاک ذات کی مہربانی ہوتی ہے چاہے وہ امیر ہو یا غریب اور اسی سبب ہر انسان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف ہوتا ہے۔ اختر کہتے ہیں کہ:

مسافر مست تھے کیف نوا سے
کہ ماہ عید نے جھانکا فضا سے
ہر اک بے خود ہوا ذوق دعا سے[۱۳]

عرب ریگستان کے مسافر مست نغمے گا رہے ہیں اور اس خمار آلود آواز سے ان کے رگ و پے میں مستی چھا رہی ہے۔ وہ اس لیے بھی خوشی سے جھوم رہے ہیں کہ عید کے چاند نے اپنا جلوہ دکھایا ہے اور اسی اثنا ہر کوئی دعا مانگنے کے نشے میں سرشار ہیں۔ عید کا چاند دکھائی دینے پر سب اس لیے خوشی کا اظہار کر رہے ہیں کیوں کہ عید کا چاند ایک مشہور مثل ہے جو مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔ اس کی اہمیت وہ لوگ جان سکتے ہیں جنھوں نے عرب جیسے گرم علاقے میں ایک نہیں بلکہ پورے تیس روزے رکھے ہوں۔

طراوت آگئی موج صبا میں
بہاریں کھیلتی ہیں اس فضا میں
بسی ہے عید کی نکہت ہوا میں[۱۴]

عید سنتے ہی نہ صرف انسان بلکہ صبح کی تازہ ہوا بھی اور نکھری اور ٹھنڈی ہوئی اور ہر طرف خوشی و سرور کا سما ہے یہ سب عید کی بدولت ہے جس نے ہر چیز پر بہار کا منظر پیدا کیا ہے اور اس کی خوشبو ہر چیز کی نس نس میں اتر رہی ہے۔

اختر شیرانی کا شمار ان نظم گو شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے قیام پاکستان سے پہلے دور میں نظمیں کہیں اس وقت ہندو اور مسلمان مشترکہ ہندستان میں قیام پذیر جس کے باعث ادب میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی تہواروں اور رسوم و رواج کا ذکر تواتر سے ملتا ہے۔ اختر نے اپنی نظموں میں ہندی الفاظ رسم و رواج اور عبادت گاہوں کا ذکر بڑی خوب صورتی سے کیا ہے اپنی ایک نظم بنارس میں یوں کہتے ہیں۔

ہر اک کو بھاتی ہے دل سے فضا بنارس کی
وہ گھاٹ اور وہ ٹھنڈی ہوا بنارس کی
وہ مندروں میں گجردم پجاریوں کا ہجوم
وہ گھنٹیوں کی صدا وہ فضا بنارس کی
تمام ہند میں مشہور ہے یہاں کی سحر
کچھ اس قدر ہے سحر خوش نما بنارس کی
پجاریوں کا نہانا وہ گھاٹ پر آکر
وہ صبح دم کی فضا دل کشا بنارس کی [۱۵]

بنارس ہندوستان کے مشہور شہر کا نام ہے۔ جو ہندوؤں کا تیرتھ ہے۔ تیرتھ مقدس مقامات کو کہتے ہیں جو دریا کے کنارے پر ہوں۔ یہ وہ شہر ہے جہاں ہندو لوگ اپنی عبادات کے لیے آتے ہیں اور یہاں ان کے مختلف رسم و رواج کی تکمیل ہوتی ہے۔ جب بنارس کا نام لیا جاتا ہے تو لوگوں کا ذہن گنگا ندی اور مختلف گھاٹوں کی طرف چلا جاتا ہے ۔اختر کے خیال میں بنارس کی ہوا لوگوں کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ ہر اپنے جیون میں ایک دفعہ یہاں آنے کی خواہش کرتا ہے۔ یہ شہر گنگا ندی کے کنارے موجود ہے۔ اس شہر میں ہندوؤں کی بہت سے مقدس مندر موجود ہیں جیسا کہ بریڈ کل کا مندر، برہما کا مندر، بشیشور کا مندر، مان مندر، اسی مندر وغیرہ۔ ان مندروں کے ساتھ ہندوؤں کی بہت سی روایات جڑی ہوئی ہیں۔ مندروں کے علاوہ یہاں مختلف گھاٹوں پر ہندو اپنی مذہبی رسمیں ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ گھاٹوں کے نام یہ ہیں۔ اسی سنگم، رشاسومیدھ گھاٹ، امرت کنڈ، ناگ کنواں۔ ان گھاٹوں سے ہندوؤں کے مختلف رسم و رواج منسوب ہیں۔ جن پر ان کو کامل یقین ہے۔

اختر نے خاص طور پر بنارس کی صبح کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بنارس کی صبح ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔ یہاں روز تین بجے سے لے کر آٹھ بجے دن تک اشنان کرنے والوں کا گنگا کے کنارے بہت بڑا ہجوم رہتا ہے گویا ہر روز ایک میلا لگتا ہے۔ اسی صبح سے متاثر ہو کر غالب نے بھی اس پر قصیدہ لکھا ہے۔ بقول اختر

وہ کشتیوں کا سماں اور وہ سیر گنگا ہ کی
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جان فزا بنارس کی
ہمارے دل سے نکلتی ہے یہ دعا اختر
کہ پھر بھی شکل دکھائے خدا بنارس کی[۱۷]

اختر شیرانی کی نظموں میں تاریخ کی عکاسی:

گزرے ہوئے زمانے کی روداد کو تاریخ کہتے ہیں۔ لسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو "تاریخ" انگریزی زبان کا لفظ History کے مترادف ہے جو لاطینی یا یونانی لفظ Historia سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں Knowing ،Knowledge ، علم یا جانچنا، پرکھنا۔ اصطلاح میں تاریخ کسی عہد کے پچھلے واقعات وحالات کا ریکاڈ ہوتی ہے۔ یہ انسان کے ماضی کا وہ حصہ ہے جو حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ صرف ماضی کے افراد کی کہانی نہیں ہوتی بلکہ اس میں گزرے ہوئے زمانے پر تبصرہ اور تجزیہ ملتا ہے۔ تاریخ میں مورخ گزرے ہوئے زمانے کی تصویر کھنچتا ہے۔ بقول پروفیسر مجیب:

> اس کو نیستی میں رنگ بھر کر ہستی کو صورت بنانے کا فن آتا ہے۔[۱۷]

اگر مورخ صرف گزرے ہوئے واقعات کو جمع کرنا شروع کر دے تو یہ واقعات کا خشک اور بے معنی ڈھیر بن جائے گا۔ اس لیے اس کو معنی فراہم کرنے کے لیے حقائق کی تشریح اور حقائق پیدا کرنے والے اسباب واثرات کا مطالعہ ایک لازمی جز ہے گزرے ہوئے زمانے کے بت میں جان ڈالنا ضروری ہے۔ تاریخ کے حوالے سے پروفیسر مجیب کہتے ہیں:

> تاریخ میں یہ صفت ہے کہ وہ اس چیز کو نہیں دیکھتی جو کہ موجود ہو بلکہ جستجو اور تحقیق قیاس اور عقل کا سرمہ لگا کر ایسی دور بین ہو جاتی ہے کہ موت اور نیستی کا بھاری آنچل بھی اس سے کچھ چھپا نہیں سکتا اور ایک زمانہ جو کب کا گزر چکا ہوتا ہے۔ اس کے سامنے تصویر بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔[۱۸]

مورخ گزشتہ عہد کو زندہ بنانے کے لیے قیاس اور تخیل سے کام لیتا ہے اور تحقیق و جستجو کو اپنا کر اصل واقعے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

مشہور عربی محقق، مورخ اور دانش ور ابن خلدون نے تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک ظاہری یا خارجی حصہ دوسرا باطنی حصہ۔ ابن خلدون کے خیال میں ظاہر پر سب کی نظر پڑتی ہے لیکن باطن تک اہل نظر اور اہل بصیرت لوگ پہنچ سکتے ہیں۔ تاریخ کا ظاہری پہلو وہ ہے جس میں گزرے دنوں گزشتہ واقعات اور حکومتوں کے واقعات

اور پچھلی صدیوں کے تجربات کا ذکر پایا جائے۔ انہوں نے ظاہری پہلو کی مزید وضاحت بھی کی ہے۔ ان کے خیال میں تاریخ یہ بھی دکھاتا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات لوگوں پر کیا اثر ڈالتے ہیں اور کس طرح حکومتیں عروج اور زوال تک پہنچتی ہیں وہ تاریخ کی باطنی سطح تک پہنچنے کے لیے شعور اور دانشوری کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ واقعات کے پیچھے مختلف اسباب کو معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ شعور اور بصیرت مورخ کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کی نگاہ ناقدانہ ہو۔ وہ مختلف چیزوں میں اختلافات اور تضادات تک پہنچتا ہو تاکہ اس پر اپنے حسن نظر سے کوئی رائے دے سکے۔ اسے کائنات کے اصول، سیاسی قاعدے، انسانی معاشرے اور کائنات کے احوال کی خبر ہو ابن خلدون تاریخ نگاری میں غیر جانبداری کا قائل تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ مورخ کو بغیر کسی تعصب اور جانبداری سے تاریخ نگاری کرنی چاہیے۔ اس کے خیال میں مورخ کو تمدن سے آگاہی ہونی چاہیے تاکہ وہ موثر تاریخ لکھے۔

تاریخ کے حوالے سے مختلف مفکرین کے درمیان اختلاف رائے بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ معاشرے میں ایک طبقہ ایسا بھی دیکھنے میں ملتا ہے جو اسے غیر ضروری چیز قرار دیتا ہے یعنی کہ کوئی تاریخ کو بکواس سمجھتا ہے تو کوئی بیکار۔ انیسویں صدی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ تاریخ صرف ماضی کی سیاست ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک فضول واقعات کا بوجھ ہے جو انسانی ذہن پر طاری ہے۔ یہاں تک بھی کہا جاتا ہے کہ تاریخ موجودہ زمانے اور مستقبل کے لیے اہمیت نہیں رکھتا لیکن معاشرے میں ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو تاریخ کو ایک فائدہ مند چیز قرار دیتا ہے۔ انسان ہمیشہ اپنی غلطیوں سے سیکھتا ہے اور ان کے نزدیک تاریخ انسان کو یہ موقع بھی فراہم کرتی ہے۔ اس طرح انسان ماضی کی غلطیوں سے کچھ سیکھ کر اپنے حال اور مستقبل کو سنوارتا اور نکھارتا ہے۔ کچھ مورخین اور ناقدین تاارخ کو وقت کا ایک تسلسل مانتے ہیں اور اسے گزرے ہوئے زمانے موجودہ زمانے اور آنے والے وقت میں تقسیم کرنا نہیں چاہیے اس حوالے سے ابن خلدون لکھتے ہیں۔

> گزرا ہوا زمانہ آنے والے زمانے سے اس قدر مشابہ ہے کہ ایک جگہ کا پانی، دوسری جگہ کے پانی سے بھی نہیں ہوتا۔ [۱۹]

کروچے جو ۲۱-۱۹۲۰ میں اٹلی کا وزیر تعلیم تھا وہ تارریخ کے بارے میں کہتا ہے کہ کوئی بھی تاریخ ہم عصر تاریخ ہوتی ہے۔ تاریخ کے لیے حقائق اکٹھے کرنا ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر تاریخ کا کوئی وجود نہیں ہوتا لیکن حقائق کے ساتھ واقعات بھی اہمیت کے حامل ہونے چاہیے۔

تاریخ کے ساتھ ایک لفظ تہذیب بھی دیکھنے اور سننے میں ملتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ تہذیب کسی بھی معاشرے کے ظاہری اور باطنی معاملات کا مظہر ہے۔ جس میں انسانی رہن سہن، فنون لطیفہ و

تفریح کے تمام ذرائع، عقائد و نظریات، مذہبی معاملات سب شامل ہے اور تاریخ اپنی تہذیبی اونچ نیچ کا ایک حقیقی دستاویز ہے۔ تاریخ اس زمین پر موجود ہر کام، واقعے اور تصورات کو اپنے آپ میں سمیٹتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کسی بھی عہد کے تاریخی مطالعے سے اس عہد کے تہذیبی حالات کا پتہ بآسانی چلتا ہے۔

ادب اور تاریخ کا رشتہ آپس میں بہت گہرا ہے۔ ادب انسانی معاشرے کا ایک اہم عنصر ہے اس کے ذریعے انسان اپنے ماضی کو دیکھ سکتا ہے اور حال و مستقبل کو سنوار کر ترقی کی نئی راہیں تلاش کر سکتا ہے۔ ہر زبان کے ادب میں تاریخ کی تصویر کشی لازمی ہوتی ہے۔ بقول جمیل جالبی:

> ادب جن دنیاؤں میں ہمیں لے جاتا ہے وہ حقیقی دنیا سے زیادہ حقیقی ہوتی ہیں۔[20]

ہماری زندگی کے اصل واقعات ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہوتے لیکن ادب یہ اہم فریضہ سر انجام دے کر ان واقعات کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ادب اور تاریخ علم کے دو الگ الگ شعبہ جات ہیں لیکن ان کا آپس میں ایک گہرا تعلق ہے۔ اگر کسی معاشرے کے پاس تحریری صورت میں تاریخ موجود ہو یا نہ ہو لیکن یہ ایک فطری عمل ہے کہ انسانی ذہن میں اپنے ماضی کے حوالے سے کوئی نہ کوئی افسانوی تصور موجود ہو اسے ہم معاشرے کا اجتماعی تاریخی احساس کہہ سکتے ہیں۔ کوئی بھی تخلیق کار جب کسی تخلیق کو پیش کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کسی موضوع کو چنتا ہے وہ اس کے موجودہ صورت حال کے ساتھ یہ بھی جاننے کی کوشش میں ہوتا ہے کہ اس کے موجودہ صورت حال کے لیے کس حد تک اس کا گزرا ہوا وقت بھی ذمہ دار ہے۔ بقول قراۃ العین حیدر:

> میں تو بعض وقت سوچتی ہوں کہ لوگ بغیر تاریخ سوچے ہوئے کس طرح بات کر لیتے ہیں کس طرح لکھ لیتے ہیں۔[21]

انسانی معاشرے میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں تاریخی شعور سے ہمیں معاشرے کی تبدیلیوں کا علم ہوتا ہے اور یہ بھی جان سکتے ہیں کہ آج ہم کہاں پر کھڑے ہیں۔

ادب چوں کہ زندگی کا عکاس ہوتا ہے اس لیے جو ادب اپنے عہد کی مکمل اور اچھی تصویر کشی کرتا ہے۔ وہی ادب زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ جو فن پارے ماضی کے حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ادب میں تاریخ کے حوالے سے کم و بیش تمام نثر نگاروں اور شعرا نے ہر صدی میں قلم اٹھایا ہے۔ چوں کہ انسان اپنے ماضی سے کٹ کر نہیں رہ سکتا اور انسانی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ اگر ماضی میں ترقی کے مراحل سے گزرا ہے تو وہ اسے اپناتا ہے اور اگر زوال پذیر ہوا ہے تو وہ ایسے واقعات و حالات کو ترک کر دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال مسلمانوں کی درخشاں کتاب قرآن مجید ہے جس میں مختلف واقعات کو دیکھنے اور سننے سے پتہ چلتا ہے کہ کن کن عملیات نے انسانوں کو ترقی بہم پہنچائی اور کن واقعات و حالات کی وجہ سے انسان زوال پذیر ہوا۔ پس

تاریخ انسان کی سب سے بڑی اور قریبی دوست ثابت ہوئی ہے۔ یہ اانسانی تہذیب کا وہ اہم حصہ ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک تمام اہل دانش لوگ اس سے بچ نہ سکے اور اس کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ اور نتیجے میں آج کا انسان اپنے اباواجداد کے کارناموں اور ان کے رہن سہن کے طور طریقوں سے آشنا ہوا۔

بقول ڈاکٹر ساجد امجد:

> عام طور پر تاریخ جن باتوں کی طرف سرسری غور و فکر کر کے گزر جاتی ہے شاعری کی باریک بین نگاہ نے اس کا احاطہ کیا ہے اور نہایت صداقت سے تاریخی واقعات کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ ان فن کاروں کو یہ احساس تھا کہ وہ محض تاریخ قلم بند نہیں کر رہے ہیں بلکہ شاعری بھی کر رہے ہیں اس لیے انہوں نے تخیل کی پرواز اور شوکت الفاظ سے وہ گلکاری کی ہے کہ یہ تاریخی واقعات ادبی حیثیت اختیار کر گئے ان فن پاروں سے جنگوں کے طریقے، ہتھیاروں کی اقسام واستعمال اور اس عہد کی بہت سے تمدنی قدروں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔[۲۲]

شاعر حضرات ایک ایسی قوم ہیں جو حالات کو جلد محسوس کرتے ہیں مثال کے طور پر دکنی کے مختلف بادشاہ، امر اور نیک صفت لوگوں کے حالات اپنی شاعری میں قلم بند کیے۔ انہوں نے ماضی میں ہونے والی جنگوں اور سیاسی اونچ نیچ کو اپنی شاعری میں محفوظ کیا۔ ان کی نظمیں اپنے عہد کی تصویر پیش کرنے میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں۔ نہ صرف اس وقت کے حالات واقعات کو بیان کیا ہے بلکہ ساتھ ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار بھی منفرد انداز میں کیا ہے۔ آج کا قاری اگر ان تحریروں کا جائزہ لے تو وہ خود کو اس دور میں محسوس کرے گا۔ اب بیسویں صدی میں آزادی کی تحریک کو لیجئے کہ جب آزادی کی تحریک چلنے لگی تو لوگوں کو اپنی تہذیب و تمدن اپنے مذہب اور تاریخ سے لگاو پیدا ہونے لگا اردو نظم میں بیسویں صدی کے شعرا نے جابجا اس کا اظہار کیا۔ اقبال، حالی، اور چکبست کی نظمیں اس رجحان سے بھری پڑی ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ کوئی بھی قوم اپنی تاریخ سے کٹ کر سانس نہیں لے سکتی۔ بیسویں صدی میں ہندستان کے باشندوں کو جنگ آزادی میں حصہ لینا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ہندستان اپنی کامیاب تاریخ سے استفادہ کر لے۔ اس حوالے سے مولانا الطاف حسین کی نظم "مسدس مدوجزر اسلام" بہت اہم ہے۔ جس میں مسلمانوں کی کامیاب تاریخ اور ان کی موجودہ زبوں حالی کے اسباب کو بیان کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ شبلی کی نظم "عدل جہانگیری" اور حفیظ کی نظم "شاہنامہ اسلام" بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

اختر شیرانی بطور ایک رومانی فنکار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ رومان پسند ہمیشہ اپنی ماضی میں جھانکتا ہے اور حال و مستقبل سے فرار حاصل کرتا ہے لیکن اختر اپنی ماضی کو پسند کرتے ہیں اور وہ اسے فراموش نہیں کرتے بلکہ بار بار مسلمانوں کو ان کی ماضی کے شاندار قصے سنا کر ان کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر یونس حسنی:

> اختر کے ہاں تاریخی رجحان اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو حالی کے ہاں مسدس شبلی کا ہاں صبح امید اور اکبر الہ آبادی، چکبست اور اقبال کے ہاں مختلف نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ [۲۳]

اختر تاریخی رجحان میں شبلی، اکبر، اقبال اور حالی سے مماثلت رکھتا ہے۔ ان شعرا نے اپنی شاندار ماضی اور تہذیب و ثقافت کو حسین الفاظ کا لباس عطا کر کے اسے جدید نسل کے لیے ایک ایسا راستہ بنایا ہے جس پر چل کر نئی نسل کبھی جھک نہیں سکے گی۔ اختر نے اپنی نظم ''اسلام کا شکوہ'' میں مسلمانوں کو ان کی ماضی کی یاد دلائی ہے۔ جس میں انہوں نے سلمان اور بلال جیسے مذہبی صحابہ کی مثال بھی پیش کی ہے۔

اے مسلمان تیری وہ دیرینہ عظمت کیا ہوئی
وہ حمیت، وہ دلیری، وہ شجاعت کیا ہوئی
کفر زار ہند کا تجھ پر اثر کیوں ہو گیا ؟
وہ عرب والوں کی اسلامی صداقت کیا ہوئی
جس کی کیفیت میں گم تھی روح سلمان و بلال
بادہ عرفان کی وہ مستانہ لذت کیا ہوئی [۲۴]

اس مرثیہ نما نظم میں مسلمانوں کو ان کی عظیم تاریخ سے روشناس بھی کیا گیا ہے۔ مسلمان جو غلام فرنگ ہو کر اپنی قیمتی ورثے کو بھول گئے اور کافرانہ طور طریقوں میں اس قدر ملوث ہوئے کہ اپنی ترقی کی بھاگیں دشمنوں کے ہاتھوں میں خود پکڑا دی۔ اختر کو اس بات کا بے حد افسوس ہے۔ وہ سلمان اور بلال کے اسلامی خدمات کو بھی مسلمانوں کے سامنے لاتا ہے تاکہ وہ حالات کی نزاکت کو سمجھ سکے۔ وہ مسدس حالی کی طرح اپنی اس تاریخی نظم کو یاس اور ناامیدی پر ختم نہیں کرتا بلکہ امید کا دامن مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھماتا ہے۔

اٹھ رہا کر دل کو خواب عیش کی زنجیر سے
گونج اٹھیں پھر فضائیں نعرہ تکبیر سے [۲۵]

اختر شیرانی نے ایک نظم ہندوستان کے تاریخی شہر لکھنو پہ لکھی ہے چوں کہ لکھنو اپنی ایک الگ تاریخی اور تہذیبی پہچان رکھتا ہے۔اس لیے بقول اختر شیرانی:

مٹ چکے ہیں اگرچہ تاج و تاجدار لکھنؤ
پھر بھی زندہ ہے ابھی روح وقار لکھنؤ
مشرقی رنگ تمدن کی ہے خالص یادگار
کیوں نہ ہو ہر مشرقی دل سے نثار لکھنو
یہ محل اسلاف کی تہذیب کا گہوارہ ہے
ہند میں کافی ہے یہ تنہا وقار لکھنؤ[۲۶]

شہر لکھنو میں جن امراء اور نوابین کا دور دوراں تھا۔وہ ختم ہو چکا ہے لیکن اس تاریخی شہر کی شان و شوکت اب بھی زندہ ہے کیوں کہ اس خطے پر ایسے ایسے اہل علم لوگ آئے جنھوں نے اپنی یادگاروں کی مدد سے اس شہر کو مرنے نہیں دیا۔سب سے بڑی مثال مرزا ہادی رسوا ہے جنھوں نے امراؤ جان ادا جیسے ناول سے اس شہر کی تہذیب و ثقافت کو مٹنے نہیں دیا۔ابواللیث صدیقی اس ناول کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> امراؤ جان ادا کو ہم نے ایک تہذیب اور تمدن کا ترجمان بنایا ہے۔یہ لکھنو کی تہذیب ہے۔ جسے شرر نے مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہا ہے۔وہ تہذیب جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر جنم دیا اور پروان چڑھایا تھا۔[۲۷]

یہ ناول لکھنوی تہذیب کا وہ شاہکار ہے جس میں اگر غیر ملکی عناصر بھی شامل ہیں تو اس پر یہ شبہ نہیں ہوتا۔ ''اسلاف کی تہذیب کا گہوارہ'' خاص کر ادبی لوگوں کی طرف اشارہ ہے جیسے آتش، ناسخ، عزیز، آرزو، مصحفی اور یگانہ ۔ان شعرا کا کلام پر تاثیر اشعار سے بھرا پڑا ہے۔اختر شیرانی تاریخ کی ان شخصیتوں سے بہت متاثر ہیں۔ جنھوں نے مر کر بھی خود کو زندہ جاوید کیا اور تہذیب و تمدن کو آفاقیت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ملکہ نور جہاں جو ہندوستان کی ملکہ کی حیثیت سے ایک درخشاں ستارے کے طور پر آسمان کے افق پر چمکی اور اپنے نور سے ہندوستان کو ایسی روشنی عطا کی جس سے آنے والی نسلوں نے فیض حاصل کیا۔اختر نے اپنی نظم ''بعض تاریخی تصورات'' میں نور جہاں کی ساری زندگی کا خلاصہ لکھ کر دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔جب ماں باپ نے سفر کے دوران جنگل میں چھوڑا اور پھر وہ کسی قافلے کے ہاتھوں لگی اور اپنی ہی ماں اس کی دایہ مقرر ہوئی۔ پھر جوانی اور شیر افگن سے شادی اور بیوگی کا سفر اختر نے بڑی مہارت سے کم الفاظ میں سپرد قلم کیا ہے۔جہانگیر کی محبت اور وفات تک

تمام مناظر چند الفاظ میں سامنے لانا کسی معمولی شاعر کا کام نہیں۔ اختر کو اس بات پر بھروسہ ہے کہ ایسے عظیم لوگ مرنے کے بعد بھی مرتے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا کر سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ بقول اختر:

ادیبوں کی زبان پر آج تک تیرے فسانے ہیں
لب شاعر پہ اب تک تیری عظمت کے ترانے ہیں[۲۸]

عالم فاضل لوگوں نے نور جہاں کو اپنی تحریروں میں قابل عزت موضوع بنایا۔ لیکن خود نور جہاں بھی کبھی کبھار شعر لکھا کرتی تھیں۔ باقاعدہ کوئی دیوان مرتب نہیں کیا لیکن اس کی بعض قسم کی شاعری اکثر تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ شیر افگن خان اپنے شوہر کے قتل ہو جانے پر اس نے ایک بسیط مرثیہ بھی لکھا تھا۔[۲۹]

اختر شیرانی نے نور جہاں کی عظمت و بلندی کو یوں بیان کیا ہے۔

تو جان عاشقی ! کان وفا ! شان حکومت تھی!
تیری سب سے بڑی توصیف یہ ہے ایک عورت تھی!
زمانہ جا نچتا رہتا ہے سچے آشناؤں کو !
ہمیشہ یاد رکھے گا تیری خالص وفاؤں کو
ہوتی مر کر بھی خوابیدہ تو شوہر کے پہلو میں
جگہ پائی جہانگیر ابن اکبر ہی کے پہلو میں [۳۰]

اختر نور جہاں کو محبت کی دیوی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں یہ بڑی بات ہے۔ کہ عورت ہو کہ حکومت سنبھالنا آسان نہیں۔ لیکن بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اختر عورت کی تعریف میں محو ہے۔ اختر کی تمام شاعری میں کہیں نہ کہیں عورت کی حکمرانی ملتی ہے۔ وہ کائنات کا سکون عورت کو قرار دیتے ہیں۔ چاہے وہ سلمیٰ ہو، ریحانہ، عذرا، ماں، بیوی یا پھر نور جہاں۔ نور جہاں کو عورت ہونے کے ناطے خوش نصیب تصور کرتے ہیں اور اس بات کی طرف قدم بڑھاتے ہیں کہ تو اتنی خوش قسمت تھی کی مرنے کے بعد بھی جہانگیر جو بادشاہ اکبر کا وارث تھا ، کے قریب ہوئی اور زندگی میں بھی اس کے دل پر راج کیا۔ اختر نے نور جہاں پر ایک اور بھی نظم لکھی ہے۔ جس میں وہ اس کے مزار پہ گئے ہیں اور بے اختیار تاریخ کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے تصور میں خود سے ہم کلام ہیں۔ سلمیٰ جو ان کی شاعری کا مضبوط حوالہ ہے۔ یہاں بھی اختر ان سے دامن نہیں بچا سکے اور نور جہاں کے مزار پہ سلمیٰ کے دیدار کو شاعرانہ شکل دی۔ وہ فرماتے ہیں:

مزار نور جہاں پر وہ شوخ آئی ہے !
گماں ہے خلد سے حور جناں نکل آئی ہے
نقاب گل سے شمیم نہاں نکل آئی
کہ اپنی قبر سے نور جہاں نکل آئی [۳۱]

سلمیٰ سے محبت اختر کا اولین فریضہ تھا جسے وہ کسی نہ کسی شکل میں نبھا رہے تھے۔ سلمیٰ کی تعریف کے لیے حور اور شمیم نہاں کہنا اختر کی محبت کا ثبوت ہے۔ یہاں تک کہ اپنی محبوبہ کو نور جہاں کہنا کسی عزت و تکریم سے کم نہیں۔ یہاں اختر کی محبت پورے زوروں پر ہے اور اس کے لیے ایسے استعارات کا استعمال کوئی معمولی فنکاری نہیں۔ آپ نے اپنے خیالات کو خوب صورت اور بہت نادر الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

اختر شیرانی کا بیشتر کلام مذہبی موضوعات پر مشتمل ہے۔ وہ تاریخ کی ان شخصیات کو موضوع سخن بناتے ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے عہد کے لیے محنت و مشقت اور عدل و انصاف سے کام لیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا راستہ بنایا جس پر چل کر وہ کبھی جھک نہیں سکیں گے۔ چاہے وہ قومی ترقی ہو یا تہذیبی ترقی۔ حضرت علی کو مثال بنا کر مسلمانوں کو ایک مثبت راہ دکھائی ہے۔

ہے اب بھی یاد زمانے کو ذوالفقار علی
علی کرم کی یاد ہے دنیا میں یادگار علی
وہ دلق پوش کہ سب بادشاہ کہیں جس کو
وہ خاکسار کے بشر خدا کہیں جس کو
وہ اس کا خلق کہ شمع ہدا کہیں جس کو [۳۲]

مولانا بدر الدین حضرت علی کی شخصیت کے حوالے سے یوں فرماتے ہیں:

آپ تصوف، شریعت، اخلاق بلکہ مکمل اسلامی ثقافت میں دوسروں کے مقابلہ میں ایک اہم صاحب الرائے کی حیثیت کے مالک ہیں۔ [۳۳]

حضرت علی وہ مکمل شخصیت گزرے ہیں جو موجودہ اور آنے والے عہد میں زندہ و جاوید ہیں۔ ان کو گزرے ہوئے کئی صدیاں گزر گئی ہیں لیکن وہ اپنی بہادری، اخلاق اور محبت و شفقت کی وجہ سے آج بھی لوگوں کے دلوں میں

زندہ ہیں۔ وہ ایسے بہادر انسان تھے کہ دشمن کی صفوں کو تن تنہا اکھڑ کر رکھتے تھے۔ حضرت علی کی تلوار جس کا نام ذوالفقار تھا۔ وہ اہمیت کی حامل تلوار تھی شمیم کرمانی اپنی کتاب ذو الفقار میں یوں رقمطراز ہیں۔

> ذوالفقار وہ تلوار ہے جو رسولؐ اسلام کے ذریعے حضرت علی کو خدا کی طرف سے عطا ہوئی اور ہر اس جنگ میں سرسبز اور کامراں رہی جو اسلام کے مقاصد کو پھیلانے یا تقویت پہنچانے کے لیے کی گئی۔[۳۴]

اختر نے خاص طور پر یہاں ''ذوالفقار'' کا تذکرہ کیا ہے کہ اس تلوار سے باطل قوتوں کے خلاف جنگیں لڑی گئیں۔ اب بھی دنیا والے اس کو یاد کر کے خود کو دشمنوں کے خلاف جنگ کے لیے تیار کر رہے ہیں اور یہ حضرت علی کا اپنی آنے والی نسلوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ایسی عظیم الشان یادگار چھوڑی ہے۔ علی نے بہت عجز وانکساری سے حکومت کی تھی۔ آپ میں ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود غرور و تکبر نام کی چیز نہیں تھی۔ اپنے وقت میں سب کی مشکلیں حل کرنے والے اور لوگوں کے لیے ہدایت کا شمع روشن کرنے والے تھے۔ اختر نے یہاں ماضی اور حال کو جوڑنے کا کام کیا ہے کہ کس طرح ایک اچھی، نڈر اور نیک شخصیت آنے والی نسلوں اور حکومتوں کے لیے ایک روشن شمع کی مانند کام کرتی ہیں۔

اختر کے نزدیک عورت انسانی معاشرے کا وہ مضبوط کردار ہے۔ جس سے کسی خطے کی تہذیب وثقافت عروج پر بھی جاسکتی ہے اور زوال سے بھی ہمکنار ہو سکتی ہے۔ ''شمع حرم'' اختر کی وہ نظم ہے جو خواتین کے لیے بصیرت کا درس دیتی ہے۔ یہ نظم طبقہ نسواں کی اصلاح بھی کرتی ہے۔ یہ نظم ایک ایسی عورت کی زبانی ہے جو شادی کے بعد اپنی گزشتہ زندگی کے مختلف خصوصیات تاریخ میں گزرے ہوئے حالات واقعات سے جوڑتی ہے۔

یاد آیا میکہ رشک طور تھی ہستی مری
جلوہ ہائے قدس سے آباد تھی ہستی مری[۳۵]

عورت اپنی ماضی کی پاک دامنی پر فخر کرتی نظر آرہی ہے کہ میرا گھر میرے کام کے سلیقے اور قرینے سے اور میری پاک دامنی سے آباد اور خوش حال ہے۔ وہ مزید کہتی ہے:

آتش نمرود تھی جب آسماں تک شعلہ زن
خلد بن کر تب ابراہیم کا گہوارہ تھی
دیدہ یعقوب میں تھی جلوہ امید میں
نوح کی کشتی میں حسن چارہ پیچارہ تھی
شکل یوسف میں برنگ حسن جانانہ تھی میں

سینہ عیسیٰ میں قم کا ساز مستانہ تھی [۳۶]

اختر نے چند تاریخی واقعات کو دو تین اشعار میں بھرتا ہے اور یہی شاعری کا کمال اور خوبی ہے۔ عورت اپنی ماضی کی یاد کو تاریخی واقعات کی مدد سے بیان کر کے اور بھی اپنے لہجے کی اثر و تاثیر بڑھا رہی ہے۔ تاریخ میں حضرت ابراھیم کو جب نمرود نے آگ میں ڈالا تو وہ اس کے لیے جنت کا نمونہ پیش کرنے لگی۔ یہاں عورت ماضی کی تکالیف اور مصیبتوں کا تذکرہ کر رہی ہے کہ جب بھی مجھے ان دل خراش عناصر سے واسطہ پڑتا تو میں اس وقت حضرت ابراھیم کی طرح خدا پہ کامل یقین رکھتی اور وہ تکالیف میرے لیے راحت اور سکون میں بدل جاتیں۔ حضرت یعقوب کی مانند کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ میں اپنے ارد گرد کے لوگوں کے لیے حضرت نوح کی طرح تھی اور لوگوں نے ہمیشہ مجھ سے فائدہ حاصل کیا۔ نہ صرف میری سیرت اچھی تھی بلکہ حسن بھی حضرت یوسف کی مانند چاند کا ٹکڑا تھی۔ میں ایک نیک خوب صورت صفات کی ایسی مکمل نمونہ تھی کہ حضرت عیسٰی جو مردوں میں جان ڈالتے تھے اور ان کے حکم سے بے جان چیز جاندار میں تبدیل ہو جاتی بالکل اس طرح مثبت عادات اور نیک نیتی کی وجہ سے کوئی کام میری مرضی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا تھا۔ ان اشعار کی مدد سے اختر عورتوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کو یہ واضح کیا ہے کہ معاشرے میں ان کا کردار کس قسم کا ہونا چاہیے۔

اردو ادب کے شعرا نے اپنی شاعری کو تلمیحات سے سجایا ہے اور ایسے ایسے تاریخی واقعات کو پیش کیا ہے۔ جن واقعات نے اپنے اپنے عہد میں تہذیب و تمدن کو جلا بخشنے میں اہم کردار ادا کیا اور ان کی نادر تلمیحات سے شاعر حضرات نے آنے والی نسلوں کی بہت مدد کی ہے۔ قیس اور لیلیٰ وہ دو تاریخی کردار ہیں جن کا تعلق عرب سے تھا۔ قیس عرف مجنوں نے لیلیٰ سے بے انتہا محبت کی۔ اصل نام قیس تھا لیکن لیلیٰ کی محبت میں پاگل ہونے پر لوگوں نے مجنوں کے نام سے مشہور کیا۔ ان کا قصہ اردو ادب میں بہت سے شعرا نے تخلیق کیا ہے تاریخ کے یہ کردار ہمیشہ کے لیے زندہ رہیں گے۔

لیلیٰ۔۔۔ جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں
مجنوں۔۔۔ کیا کریں جاتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں
لیلیٰ۔۔۔ عشق کے صدمے اٹھائے کب تک!
مجنوں۔۔۔ گیت امید کے گائیں کب تک!
دونوں مل کر۔۔۔ آہ تقدیر، یہ کیا رنگ دکھایا ہے ہمیں
جگمگائے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں

کیا کرے جاتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں[۳۷]

تاریخ میں زیادہ تر عشق و محبت کی داستانوں میں ملاپ نہیں ہوا۔اسی طرح لیلیٰ مجنوں کے ساتھ بھی ہوا۔روایت میں ہے کہ عرب کی تاریخ میں یہ واقعہ اہمیت کا حامل ہے جس سے نہ صرف اس عہد کے لوگ آگاہ تھے بلکہ آج تک یہ واقعہ ہر عام و خاص کی زبان پر رہا ہے۔

قیس کی بے کسی جوش جنوں کے بدلے
لیلیٰ نجد کو رسوائے بیاباں کر دیں[۳۸]

تہذیب کے عناصر رسم و رواج اور تاریخ کی پیش کش اختر کی نظموں میں نمایاں ہے۔اختر کے ہاں س زیادہ ہندستانی معاشرے کے رسم و رواج کی عکاسی ملتی ہے۔عورت کی شادی، پردے سے لے کر شب برات اور عید الفطر تک کے موضوعات پہ طبع آزمائی کی۔دوسری طرف تاریخ کو بھی ساتھ لے کر چلے ہیں۔اور یہی ایک کامیاب شاعر کا خاصہ ہے۔انہیں اس بات کا علم ہے کہ کوئی بھی قوم اپنی تاریخ سے کٹ کر آگے نہیں بڑھ سکتی۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عمر،ہندستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (نئی دہلی: پبلی کیشنز ڈویژن بار دوم ۱۹۹۵ء)، ص ۲۳۔

۲۔ محمد احمد فلاحی (مرتب) ہند و مسلم کی خوشگوار یادیں (دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز ۲۰۰۴ء)، ص ۱۰۔

۳۔ محمد شمس الدین صدیقی (مرتب) رسالہ (خیر و برکت کی شادی) (حیدر آباد دکن، س ن)، ص ۶۔

۴۔ یونس حسنی (مرتب) شہرود (لاہور: بک پرنٹرز ۱۹۹۳ء)، ص ۵۲۔

۵۔ یونس حسنی (مرتب) نغمہ حرم (لاہور: بک پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ص ۷۲۔

۶۔ یونس حسنی (مرتب) اختر شیرانی اور جدید اردو ادب (کراچی: پرنٹرز و پبلشر، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۳۹۔

۷۔ یونس حسنی (مرتب) نغمہ حرم، ص ۴۷۔

۸۔ ایضاً، ص ۵۵۔

۹۔ یونس حسنی (مرتب) پھولوں کے گیت (لاہور: بک پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ص ۹۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۲۔

۱۱۔ ارشد مینا نگری، عید (مالیگاؤں شادپ آفسیٹ پرنٹرز، ۲۰۱۰ء)، ص ۹۔

۱۲۔ یونس حسنی (مرتب) شہرود، ص ۶۲۔

۱۳۔ یونس حسنی (مرتب) اخترستان (لاہور بک پرنٹرز ۱۹۹۳ء)، ص ۱۰۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔

۱۵۔ یونس حسنی (مرتب) پھولوں کے گیت (لاہور: بک پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۸۔

۱۶۔ ایضاً، ص، ۱۸۔

۱۷۔ محمد مجیب، تاریخ تمدن ہند (نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ ۱۹۷۲ء)، ص ۱۷۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۷۔

۱۹۔ ادبی زوایے ،کل پاکستان اہل قلم کانفرس ۱۹۸۳ کے مقالات کا مجموعہ ،اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۸۲۔
۲۰۔ خاور جمیل(مرتب)ادب کلچر اور مسائل (کراچی شیخ سلطان ٹرسٹ پریس،۱۹۸۶ء)، ص ۱۸۔
۲۱۔ خاور جمیل(مرتب)نوائے سروش(دہلی:انٹرنیشنل اردو فاونڈیشن،۲۰۰۱ء)، ص ۴۲۲۔
۲۲۔ ساجد امجد،اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات(لاہور:الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۲۸۔
۲۳۔ یونس حسنی،اختر شیرانی اور جدید اردو ادب ، ص ۲۶۶۔
۲۴۔ یونس حسنی(مرتب)اخترستان، ص ۱۱۹۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۰۔
۲۶۔ یونس حسنی(مرتب)صبح بہار(لاہور: بک پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ص ۹۸۔
۲۷۔ ابواللیث صدیقی،امراؤ جان ادا تنقیدو تبصرہ (اعجاز پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ص ۸۔
۲۸۔ یونس حسنی(مرتب)نغمہ حرم ، ص ۵۰۔
۲۹۔ سیماب اکبر آبادی،سوانح نور جہاں بیگم(آگرہ:الیکٹرک ابوالعلائی پریس ۱۹۲۰ء)، ص ۴۸۔
۳۰۔ یونس حسنی(مرتب)نغمہ حرم ، ص ۵۲۔
۳۱۔ یونس حسنی(مرتب)اختر ستان، ص ۸۹۔
۳۲۔ ایضاً، ص ۱۰۔
۳۳۔ مولانا بدرالدین الحافظ قاسمی(مترجم)۔حضرت علی ایک عقبری شخصیت(دہلی:مکتبہ وحیدیہ، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۶۔
۳۴۔ شمیم کرمانی،ذوالفقار (لکھنو:احباب پبلیشرز ۱۹۶۴ء)، ص ۷۔
۳۵۔ یونس حسنی(مرتب)نغمہ حرم)، ص ۱۷۔
۳۶۔ ایضاً، ص ۱۸۔
۳۷۔ یونس حسنی(مرتب) شہرود، ص ۶۳۔
۳۸۔ یونس حسنی(مرتب)کلیات اختر شیرانی (لاہور:پرنٹ یارڈ پرنٹرز، ۲۰۰۹ء)، ص ۳۸۸۔

باب چہارم:

اختر شیرانی کی نظموں میں فنون لطیفہ کی عکاسی

فن کو انگریزی میں Art کہتے ہیں۔ اگر کوئی چیز نیچر میں موجود ہے تو اسکے خلاف ایک اور شکل یا کیفیت پیدا کرنا فن ہے۔ فنکار اپنے فن میں نیچر میں موجود چیزوں کو توڑ مروڑ کر کے پیش کرتا ہے۔

مرزا سلطان احمد اپنی کتاب "فنون طیفہ" میں فن کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

معلومات اور توہمات یا جذبات کا ایک خاص طریق سے ترتیب اور ترکیب دینا ایک فن ہے۔[1]

فنکار چاہے وہ شاعر ہو، مصور، سنگ تراش یا پھر اداکار ہو، جب وہ کائنات میں موجود چیزوں کو ایک خاص ربط میں جوڑے تو یہ اسکا فن ہو گا۔ اور نتیجے میں وہ فن دوسروں کو لطف اندوز کرے۔ مثال کے طور پر جب انسان منہ سے مختلف بے ربط آواز نکالتا ہے تو وہ دوسروں پر گراں گزرتی ہیں لیکن اگر کوئی نغمہ نگار اسے ترتیب دے کر گائے یا پھر شاعر اسے مرتب کر کے شاعری کرے تو وہ ایک دل آویز فن ہو گا۔

جب انسان اپنے خیالات کا اظہار، الفاظ، رقص، شاعری، فن تعمیر یا مصوری سے کرتا ہے تو یہ اسکا فن کہلاتا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں آرٹ کی تعریف کچھ یوں ہے:

> The Expression or application of human creative skill and imagination ,typically in a visual form such as Painting or sculpture, Producing works to be appreciated primarily for their beauty or emotional Power"[2]

آرٹ میں کسی چیز کی ہو بہو تقلید نہیں کی جاتی اگر ایسا ہو گا تو نتیجے میں پیدا شدہ آرٹ درجہ کمال تک پہنچے سے پہلے دم توڑے گا۔

> آرٹ کسی چیز کی پیش کشی کا نہیں بلکہ تعبیر کرنے کا نام ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ آرٹ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں آرٹسٹ نیچر کی ہو بہو تقلید سے ہٹ کر اپنے مذاق موزونیت کے لحاظ سے نیچر کے لیے ایک خود ایجاد ہم آہنگی تجویز کر دیتا ہے۔[3]

نیچر آرٹسٹ کے دل میں خود بخود تخلیق کا ایک پر زور جذبہ ابھارتا ہے اور پھر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے نیچر کو اور بھی دل کش و حسین بنا کر سامنے لاتا ہے ضروری نہیں کہ اس میں تقلید سے کام لیا جائے کیونکہ ہر انسان کا ذوق

الگ الگ ہوتا ہے اس کی سب سے بڑی مثال اردو ادب کے مختلف شعرا اور نثر نگاروں کی ہے۔ان میں بعض کا نام نثر میں جب کہ کچھ کا نام شاعری میں زیادہ مقبول و معروف ہوا۔

آرٹ کے لیے آرٹسٹ کا احساس اور جذبہ ضروری ہے جب آرٹسٹ کسی فنی نمونے کو سامنے لاتا ہے چاہے وہ مصوری ہو، مجسمہ سازی، شاعری یا موسیقی۔ سب سے پہلے وہ اپنے کام کا جانچنے والا ہوتا ہے جب آرٹسٹ اپنے کام میں خود کو محو کرتا ہے تو اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ساری قوت اس کے کام میں منتقل ہو رہی ہے۔ وہ یہ جانتا ہوتا ہے کہ اس کا کام دوسروں کی آنکھیں دیکھیں گی اور دوسروں کے کان سنیں گے لیکن ایک اچھا آرٹسٹ اپنے کام کے دوران اس چیز پر زیادہ توجہ نہیں دیتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ سب سے پہلے اس کے جذبات کی ترجمانی ہو سکے اگر وہ بھرپور محنت اور لگن سے اپنے خیالات کا اظہار اچھوتے انداز سے کرے گا تو اس کو فن سے دوسرے ویسے متاثر ہوں گے جیسے آرٹسٹ خود۔ جذبات کے علاوہ حسن بھی آرٹ کی پیشکش میں اہم عنصر ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ انسان حسین چیزوں کو دیکھ کر اسکی جانب کھینچا ہے۔ یہ احساس تقریباً ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی بچہ جب حسین چیز کو دیکھتا ہے تو کھل اٹھتا ہے مگر جب اس کے سامنے کوئی بد نما چیز، جیسے جن اور بھوت آتا ہے تو وہ ڈر اور خوف میں مبتلا ہوتا ہے اسی طرح اگر آرٹ میں حسن و جمال کی کار فرمائی ہو گی تو اسے ہر شخص پسند کرے گا چاہے دوسری صدی کے لوگ کیوں نہ ہو۔

بقول ڈاکٹر غلام یزدانی:

> حسن کا احساس انسان کی فطرت میں ہے۔ یہ احساس چند ذہنی اور جسمانی کیفیتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ آرٹ ان کیفیتوں کو موثر اور منظم طریقوں سے ادا کرتا ہے۔[۴]

جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز خوبصورت ہے تو اس کو واضح کرنا زیادہ اہم بات نہیں کیوں کہ ہر شخص حسن دیکھنے کا شوقین اور دلدادہ ہے۔ جب کہ فنون لطیفہ میں اہم بات بد نما اور بد صورت اشیا میں اعلیٰ تناسب خوبی اور کمال دکھلا کر قدرت کا حسن نظم ثابت کرنا ہے۔

فن کی ابتدا:

جب انسان اس دنیا میں وارد ہوا تو اسکی بدولت دنیا آباد ہوئی۔ ورنہ آدمی کے بغیر دنیا ایک ویران جنگل تھی۔ خود کے آرام و سکون کیلئے انسان نے ہاتھ پاوں مارے عمارتیں بنائیں۔ خوبصورت باغ لگائے، کھیت بنائے، دریاوں کو پار کرنے اور طویل مسافت طے کرنے کیلئے جہاز تیار کیے۔ اندھیر سے بچنے کے لیے روشنی ایجاد کی۔ جسم ڈھانپنے کیلئے پتوں اور بعد میں کپڑے کا لباس بنایا۔ لیکن یہ سب ایک لمحے میں نہیں ہوا بلکہ اس دنیا کو سجانے اور بنانے کیلئے انسان کو خاصی تگ و دو اور وقت سے کام لینا پڑا اور ایک طویل عرصے کے بعد کامیابی کی راہ تلاش کی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تو انسانی خواہشات اور ضروریات بڑھنے لگیں کھانا پینا اور تن کو ڈھاپنا انسان کے اولین ضروریات تھے لیکن ان

ضروریات کی تکمیل کے بعد انسان نے اپنے گرد و پیش دنیا کو سجانے کا سوچا اور یوں مختلف فنون کی طرف مائل ہوا۔ انسان کی فطرت میں یہ بات موجود ہے کہ جب وہ کسی چیز کو دیکھتا ہے تو اس کی نقل کرتا ہے۔ اس حوالے سے بڑی مثال کسی بچے کی پیدائش ہے۔ جو پیدا ہونے کے کچھ دنوں بعد اپنے ارد گرد لوگوں کی نقل کرتا ہے۔ اور اسی سہارے چلنا پھرنا، بولنا اور کھانا پینا سیکھ لیتا ہے۔

سیما پرویز اپنی کتاب ''آرٹ کی کہانی'' میں کہتی ہیں:

> انسانی تہذیب کا جب بچپن تھا تو اس نے بھی اس نقل سے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ اور جب اس نقل کو کوئی شکل دینا چاہی تو پھر یہ اس کا آرٹ یا فن بنا۔[5]

ابتدائی دنوں میں انسان کیلئے سب کچھ نیا تھا لیکن یہ بات سامنے ہے کہ اس نے جو دیکھا ویسے بیان کیا۔ بعد میں اسکے نمونے مختلف ماہرین کے ہاتھوں میں آ گئے۔ بیشتر ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ آرٹ کے ابتدائی نمونے غاروں میں ملتے ہیں اس وقت انسان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا لیکن اپنے خیالات کا اظہار مختلف تصاویر کے ذریعے کیا ۔اس کی مثالیں چین، یونان، روم اور ہندوستان کے غاروں میں بکھری پڑی ہیں۔ بہت سی تصاویر غاروں کی دیواروں اور پتوں پر بڑی خوبصورتی سے بنائی گئی ہیں۔ ان تصاویر سے ان کے عہد کے حالات اور دلچسپیوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ان کو دیکھ کر یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ اس وقت ان کے عقائد کیا تھے۔ ان میں کچھ ایسے جانوروں کی تصاویر ہیں جو وہ لوگ کھاتے تھے۔ مثلاً بھیڑیا، جنگلی گھوڑے، ہاتھی ور کچھ ایسے جانور بھی جو اب نہیں پائے جاتے۔ کچھ ایسی تصاویر بھی نقش ہیں جو لوگ آج کل بناتے ہیں۔ ان جنگلیوں نے پتھروں اور دیواروں پر مصوری کر کے اپنے آنے والے فنکاروں کیلئے فنکاری کی داغ بیل ڈالی بعد میں ایسا بھی ہوا کہ بہت سے مجسمے بنائے گئے اور ان مجسموں کو فروغ بھی ملا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ زیادہ عرصے کیلئے محفوظ رکھے جا سکتے تھے۔ ابتدائی دور کے بعد تمام علوم و فنون کا باقاعدہ آغاز یونان سے ہوا۔ ان کی شاعری مجسمے اور فن تعمیر کے بے شمار نمونے بھی میسر ہیں۔ تاریخ میں بہت سے شہر ایسے گزرے ہیں جہاں زلزلوں سے پورے کے پورے شہر زمین میں دفن ہوئے۔ مثلاً اٹلی کا شہر پاپیائی زمین میں زلزلے کی وجہ سے دفن ہوا اور سترہ سو سال کے لمبے عرصے کی کھدائی کے بعد اس پورے شہر کو نکالا گیا۔

یہاں در و دیوار پر وہ تصاویر سامنے آئیں جو اس وقت روم کے فنکاروں نے بنائی تھیں۔ یہ فنون لطیفہ کی خاصیت ہے کہ اسکی بدولت کسی مرے ہوئے شہر کو صدیوں بعد بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

فنون لطیفہ کو ابتدا سے آج تک کافی فروغ ملا اور اس میں وقت کے رد و بدل ہونے گا۔ وقت کے سیلاب نے اس تند و تیز دھارے کو روکا نہیں بلکہ اور بھی اسکے موجوں میں تیزی لائی اور آج یہ ترقی یافتہ شکل میں جاری و ساری ہے۔

اقسام فنون:

فنون کی دو بڑی قسمیں ہیں۔

۱: فنون لطیفہ یا فنون کبیرہ

۲: فنون متعارفہ یا فنون صغیرہ اور فنون مفیدہ

فنون متعارفہ سے وہ فنون مراد لئے جاتے ہیں جن پر عام زندگی کا دارومدار ہے۔ان فنون کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہے۔ان فنون سے انسان ترقی کر کے فنون لطیفہ کے حدود میں داخل ہوتا ہے۔

فنون متعارفہ کی قسمیں مندرجہ ذیل ہیں۔

فلاحت، باغبانی، کماری، آہن گری، قصابی، حجام گری، جلد سازی، آئینہ سازی، دواسازی، زرگری، ملاحی، خیمہ دوزی، کشیدہ کاری، رنگ سازی اور مرصع کاری وغیرہ۔

فنون لطیفہ:

فنون لطیفہ فنون متعارفہ کی شاخیں ہیں بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ فنون عام لوگوں میں پروان چڑھے اور یہ فنون ان سے ورنکل کر خواص کے پاس آئے۔فنون لطیفہ میں ان لوگوں نے ترقی کی جو فطری طور پر اس طرف مائل تھے۔مثلاً اگر ایک شاعر پیدائشی طور پر شاعر نہ ہو تو وہ کبھی بھی اچھا نہیں بن سکتا۔فنون لطیفہ کے عموماً چھ اقسام بتائی جاتی ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

الف۔ شاعری

ب۔ موسیقی

ج۔ مصوری

د۔ سنگ تراشی

ھ۔ فن تعمیر

و۔ رقص

بعض لوگ تقریر اور تحریر کو بھی فنون لطیفہ میں شمار کرتے ہیں۔یہ فنون بظاہر ایک دوسرے سے جدا جدا معلوم ہوتے ہیں جب ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔تو دوسرے کا خیال نہیں آتا کوئی شخص شاعری سے موسیقی یا مصوری کا تصور نہیں کر سکتا۔اور نہ موسیقی دان کو مصور، شاعر کو موسیقی دان یا مصور کو سنگ تراش کہا جاتا ہے لیکن غور کرنے سے ان میں ایک نسبت نظر آتا ہے۔ان فنون کا تخیل اور تصور ایک ہی اصول کے ماتحت اور ایک ہی گر کے تابع ہے۔

ایک ہی خیال سے ان کی بنیاد پڑی ہے۔ فنون لطیفہ کا مواد فطرتاً ہر طبیت میں رکھا گیا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں اس کا شوق رکھتا ہے۔ انسان کے ساتھ جانوروں میں بھی یہ شوق ملتا ہے۔ مثلاً فن تعمیر میں بیا کی کاریگری مشہور ہے۔ یہ چھوٹا سا جانور بڑی خوبصورتی اور نفاست سے اپنا گھونسلہ بناتا ہے۔

فنون لطیفہ میں شامل فنون کا آغاز انسانی پیدائش کے ساتھ ہوا۔ جب انسان نے باتیں شروع کیں اور خاص قسم کی آوازیں نکال کر الفاظ کا سانچا دیا تو غالباً اس وقت موسیقی اور شاعری کی ابتدا ہوئی۔ انسانی آوازوں کی تھوڑی سی خوبصورتی نے موسیقی کو جنم دیا اور جب الفاظ کو نظم وضبط کے جوڑا تو شاعری وجود میں آنے لگی۔

تحریر میں جذباتی پہلو نے جب اپنا حصہ ڈالا تو خطابت اور ادب سامنے آیا۔ انسانی جسم نے ایسی ایسی حرکتیں کیں کہ وہ رقص کی تصویر پیش کرنے لگی۔ جنگلی انسان نے جب اپنے شکار کے تجربوں کو زبان کے علاوہ اعضا کی حرکتوں سے بیان کیا تو اداکاری شروع ہوئی۔ ایک دوسرے کی نقل نے ڈرامے کو ایجاد کیا۔ پھر جب جنگلیوں نے پتھروں، ہڈیوں، پتوں اور غاروں میں جانوروں اور اپنے ہم جنسوں کی تصویریں بنائیں تو اسطرح مصوری وجود میں آئی انسان نے غاروں اور جھونپڑیوں کو بنا کر سجایا تو فن تعمیر کی بنیاد ڈالی گئی۔ رفتہ رفتہ انسان میں مہذبانہ پن آتا گیا اور انسانی ضرورتوں، دلچسپیوں میں تبدیلی آتی گئی۔ اسطرح مختلف فنون کچھ تبدیلیوں کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ ہر صدی میں فنون لطیفہ ترقی کے منازل طے کرتے گئے۔ دنیا کے ہر زبان کا ادب معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ دوسری طرف ادب بذات خود ایک آرٹ ہے۔ شاعر مشرق اور نباض فطرت علامہ اقبال کی نظموں میں فنون لطیفہ کا ذکر تواتر سے ملتا ہے۔ ان کے خیال میں مسجد قرطبہ، اہرام مصر، اور تاج محل وہ شاہ کار ہیں جن میں فنکار کی محنت اور فن کی تصویریں جھلکتی ہیں۔ اور جو وقت گزرنے کے ساتھ اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اقبال موسیقی کو ایک ایسی باطنی تپش کہتے ہیں۔ جس سے پورے وجود کو پاکیزگی اور چہرے کو تابناکی ملتی ہے۔ اگر فنکار میں عشق کا جذبہ نہیں یا روح میں تڑپ نہیں یا اسے خود اپنی آزادی کا احساس نہیں تو اس کی موسیقی بے جان ہے۔ وہ نہ خود کو سکون دے سکتا ہے نہ دوسروں کو۔

اقبال موسیقی کو ایک ایسی باطنی تپش کہتے ہیں جس سے پودے وجود کو پاکیزگی اور چہرے کو تابناکی ملتی ہے۔
اگر فنکار میں عشق کا جذبہ نہیں یا روح میں تڑپ نہیں یا اسے خود اپنی آزادی کا احساس نہیں تو اس کی موسیقی بے جان ہے۔ وہ نہ خود کو سکون دے سکتا ہے نہ دوسروں کو اقبال کے خیال میں آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندا بیداری کی روح پھونکیں اور ہمیں خواب غفلت سے جگادیں۔ اس حوالے سے ان کی تخلیقات فنون لطیفہ، جلال وجمال، شاعر، رقص و موسیقی، شعر، شعر عجم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اقبال نے فن کیلئے جلال وجمال دونوں کو اہم قرار دیا ہے۔ وہ سوز وگداز سے خالی موسیقی کو موسیقی نہیں کہتے کیونکہ اس سے صرف ناامیدی اور آہ وغم کی لہریں اٹھتی ہیں اقبال اس موسیقی

کے خواہش مند ہیں جس میں نغمہ موت کا دور دور تک سامنا نہ وہ بلکہ اس سے صرف نغمہ زندگی کی تصویر نظر آئے موسیقی کے نغمے کے لیے بھی یہی شرائط ضروری ہیں اقبال نے مصوری کو بھی موضوع بحث بنایا ہے وہ مصور کو بہت طاقتور سمجھتا ہے جو دنیا کے چہرے سے گرد ہٹانے کا ہنر جانتا ہے اقبال نے اپنے ہندوستانی فنکار کو اس بات کی تاکید کی ہے کہ وہ یورپ کی یا مغرب کی اندھی تقلید سے گریز کریں اور اپنی مشرقی تخلیقات اور روایات کو سامنے رکھے۔ اس فن کیلئے بھی وہ ذوق وشوق، عشق اور ولولے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

بقول شکیل الرحمٰن:

> موسیقی ہو یا مصوری، شاعری ہو یا فن تعمیر، فنکار کے خون جگر کی گردش ہی اسے زندہ رکھتی ہے۔[۲]

اقبال فنون لطیفہ میں زندگی کی حرارت دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس آرٹ کے خلاف ہیں جس سے قوموں میں مردنی چھائے بلکہ وہ اس فن کے خواہش مند ہیں جو قوموں کو ترقی کی رہ پر گامزن کریں اور یہی وہ آرٹ ہے جو صدیوں بعد بھی زندہ جاوید ہوتا ہے۔

فنون لطیفہ (شاعری، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی، فن تعمیر اور رقص) کا جنس سے ایک گہرا تعلق ہے۔ فارسی اور اُردو شاعری میں جنسی لگاؤ دوسری زبانوں کی نسبت زیادہ ہے۔ غزل اُردو ادب ایک جز ہے اور شاعری کی جان بھی اسکے معنی ہی عورتوں سے باتیں کرنا ہے۔ اس میں محبوب کی تعریف بیان کی جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان سب مضامین میں کہیں نہ کہیں جنسی لگاؤ نظر آتا ہے۔ اُردو ادب کے مشہور شاعر غالب کے کلام میں اس قسم کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ تاریخ پر نظر دوڑانے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یونان اور دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی بازاری عورتوں سے عشق و محبت کو عار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ہماری شاعری میں عورتوں کے حسن و جمال کے راگ تقریباً ہر شاعر نے الاپے ہیں۔ داغ دہلوی کی شاعری میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اُردو شاعری میں مرد اور عورت کے عشق کے علاوہ مرد کا مرد سے عشق کی مثالیں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ میر تقی میر جیسے سنجیدہ شاعر نے اسکا اظہار اپنے کلام میں کیا ہے۔ مثلاً لڑکے کی بھیگی مسیں، اسکا سبزہ خط اور اسکے چہرے کے خدوخال کی تعریف۔ شاعری سے ہٹ کے اگر مجسمہ سازی کو دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ فنکاروں نے نہ صرف عورتوں کے حسن کو بیان کیا بلکہ ان کے فن میں چھپا ان کا جنسی جذبہ واضح جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر یونان کے پرانے مجسموں اور اجنٹا کی دیواروں پر بنی مصوری میں عورت کی تصاویر ایک طرف جمالیات کو سامنے لاتی ہے تو دوسری طرف ان میں جنسی خمیر کارفرماں ہے۔ مصوری اور مجسمہ سازی میں جنسی لگاؤ کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ اگر ہم آرٹ کی خوبصورتی سے ہٹ کر عورت کی عریاں تصاویر کو دیکھے تو محسوس ہوتا ہے۔ کہ انسان کی جنسی خواہشات آرٹ کے دامن میں چھپے ہوئے ہیں۔ اردو

ادب کے رومانی شاعر اختر کو دیکھا جائے تو انکی نظموں میں کبھی کبھار اپنی محبوباوں کے ذکر میں لذت پسندی آجاتی ہے۔ مثلاً

میرے آغوش میں ہوگا وہ جسم مرمریں اس کا
وہ اس کے کاکل مشکیں وہ روئے نازنین اس کا
وہ رخسار حسین اس کے وہ حسن یاسمین اس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں[۷]

پھر جب وہ جوگن کو جنگل میں گاتے دیکھتا ہے۔ تو اسکے مقدس گیت اور اس سادگی اور معصومیت کے باوجود اسکے جسمانی حسن سے بھی لطف حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح کے موضوعات اختر کے ہاں بہت ملتے ہیں۔ کبھی کبھی اس جسمانی عنصر کی وجہ سے وہ بہک بھی جاتے ہیں۔ اور ایک مریضانہ سی جنسیت ان کی نظموں میں جھلکتی ہے۔ اختر کے ہاں لذتیت تو ہے مگر عریانی نہیں وہ صرف خیال ہی میں محبوباوں سے جسمانی قرب کی آرزوئیں رکھتا ہے۔ اور اسطرح وہ کسی خیالی بہشتوں میں چلا جاتا ہے۔ جوگن کو دیکھ کر کہتے ہیں،

آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں
دوشیزگی کی گنگا طوفان اٹھا رہی ہے[۸]

شعر وادب کے بارے میں اختر کا اپنا ایک نقطہ نظر ہے خلیق دہلوی کے مجموعہ مضامین وہ ادبستان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

> بظاہر ادب کا کوئی خاص مادی یا ٹھوس مقصد و فائدہ معلوم نہیں ہوتا، فنون لطیفہ میں اکثر ایسے فن ملیں گے جو اپنے مادی نفع اور مقصد سے بیگانہ ہوں گے، اور اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ادب کا وہی مقصد ہے جو شاعری یا مصوری کا ہے اور ان کی طرح اس کی پرواز بھی محض ایک قسم کی دماغی سرخوشی اور فکری سرمستی تک محدود ہے۔ شاعری اور مصوری کی طرح ادب بھی ہماری معنویت کو بیدار کرتا ہے۔ روحیت گدگدانا اور جمالیاتی احساس کو چھیڑنا۔۔۔ اور اس کے لیے یہی کافی ہے۔[۹]

اختر ادب کی افادیت کے زیادہ قائل نہیں۔ وہ ادب کو ذہنی اور دماغی خوشی تک محدود تصور کرتے ہیں۔ ادب کے علاوہ مصوری کے لیے بھی ان کی سوچ یہی ہے۔

اختر اپنی نظموں میں ورڈزورتھ کی طرح حسن سے اکتساب کے علاوہ لطف و سرور بھی حاصل کرتے ہیں۔جہاں اسے فطرت میں کمی بیشی نظر آئے وہاں اپنی تخیل کی رنگارنگی سے رنگ آمیزی کرتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر یونس حسنی کچھ یوں کہتے ہیں۔

> ان کی حسن پرست نگاہیں ان چیزوں میں بھی حسن ڈھونڈ نکالتی ہیں۔جن میں ایک عام آدمی کے لیے کوئی رنگینی و رعنائی نہیں ہو سکتی۔[10]

اختر اپنی تخیل کے زور سے فطرت کو رومانیت اور ایک حسن کا احساس دیتا ہے۔انھیں بیمار کلیوں میں بھی صحت مند حسن نظر آتا ہے۔

بہارستان کے مندر کی ان کو دیویاں کہیے
جو گل کو کرشن ہے ان کو اس کی گوپیاں کہیے
کوئی جان ملاحت ہے ، کوئی کان صباحت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے۔[11]

اختر نے خوب صورت الفاظ کو جوڑ کر بیمار کلیوں سے محبت کا اظہار ایک انوکھے انداز میں کیا ہے۔بیمار کلیوں کے لیے بھی وہ انوکھے اور اچھوتے الفاظ کو ایک دوسرے سے جوڑ کر نئے تراکیب سامنے لاتا ہے۔

وہ ورڈزورتھ کی طرح حسن کی تلاش میں رہتے ہیں۔وہ حسن کو پا کر نہ صرف خوشی محسوس کرتا ہے بلکہ وہ فطرت کی کاریگری کی تعریف کرتا ہے اور اپنے قلم سے ایسے ایسے رنگ بکھیرتا ہے جس سے اس کا قاری مسرت حاصل کرتا ہے اور یہی ایک کامیاب فنکار کا کمال ہے کہ فطرت کے حسن کو اپنی گلکاریوں سے مزید خوب صورت بناتا ہے۔وہ یہاں پر مختلف تشبیہات اور استعارات سے مدد لیتا ہے۔فطرت کی خوب صورتی و دلکشی کو اپنی تشبیہات سے سجاتے ہیں۔''مسوری'' جاتے ہوئے برکھارت سے یوں لطف اندوز ہوتے ہیں۔

پھرتی ہیں آوارہ متوالی گھٹائیں اس طرح — اور ہوائیں اس طرح
جھومتا پھرتا ہو جیسے میگساروں کا ہجوم — بادہ خواروں کا ہجوم
یوں نظر آتے ہیں کہساری مسوری دور سے — مست سے مخمور سے
جوں سمندر سے جزیروں کی قطاروں کا ہجوم — سبزہ زاروں کا ہجوم[12]

اختر اپنی نظموں میں ایک مصور کے طور پر سامنے آتے ہیں۔مرقع نگاری اور بت تراشی ان کی نظموں میں نمایاں ہیں۔بقول اختر اورینوی، اختر کیٹس کی طرح الفاظ سے بت گری بھی کرتے ہیں۔اختر نہ صرف جاندار اور سانس لیتی چیزوں کی بت گری کرتا ہے بلکہ غیر مرئی اشیا کو بھی جاندار کا روپ دینے کے ماہر ہیں وہ کہتے ہیں۔

کیا شام پڑے گلیوں میں وہی دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے
اور سڑک کی دھندلی شاموں پر سایوں کا بسیرا ہوتا ہے
باغوں کی گھنیری شاخوں میں جس طرح سویرا ہوتا ہے
اور دیس سے آنے والے بتا![13]

اور یوں کہتے ہیں کہ:

یہ ویرانہ گزر جس میں نہیں ہے کاروانوں کا
جہاں ملتا نہیں نام و نشان تک سار بانوں کا
اسی ویرانے میں ایک دن مری ریحانہ رہی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی[14]

اختر مرقع نگاری اور بت تراشی میں پورے جزئیات سے کام لیتا ہے۔اس پر جھوٹ کا شائبہ نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے اور یہی ایک کامیاب فنکار کی علامت ہے۔اختر اپنی نظموں میں نہ صرف محبوباؤں کے نام لیتا ہے بلکہ جگہ جگہ اپنی محبوباؤں کی مصوری الفاظ کے ذریعے کی ہے۔اپنی محبوباؤں کی مصوری میں ان کے تخیل کی گلکاریاں قابل ذکر ہیں۔ان کے سراپے ہر لمحہ اس کے ذہن میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ سلمیٰ جوان کی نظموں کا ایک مرکزی کردار ہے۔اس کے سراپے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

تیری صورت سراسر پیکر مہتاب ہے سلمیٰ
تیرا جسم اک ہجوم ریشم کمخواب ہے سلمیٰ
شبستان جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحر حسن فطرت کا کنارہ ہے[15]

اختر سلمیٰ کی صورت سے لے کر اس کے بدن اور جوانی تک پورے کائنات میں حسین تر ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔انھیں سلمیٰ کا حسن اس کائنات کی بے مثال شے نظر آتا ہے۔ جس کا کوئی ثانی نہیں شاعر بھی مصور ہوتا ہے ۔جس طرح ایک مصور کوئی تصویر بناتا ہے اور وہ حقیقت کے مطابق ہو بالکل اسی طرح شاعر الفاظ کے ذریعے کوئی واقعہ ،تصویر یا کیفیت کو دکھاتا ہے۔ مصور کسی تصویر کی خوبصورتی اس کے خط وخال سے سامنے لاتا ہے جبکہ شاعر الفاظ کی مدد سے منظر کو خوب صورت بناتا ہے اور اختر کو اس میں کمال حاصل ہے۔وہ اپنی شاعری میں کسی مصور سے کم نہیں۔

ترانہ، نغمہ اور راگ وہ فنون ہیں جیسے سن کر سرور اور لطف حاصل ہوتا ہے۔انسان کے علاوہ جانور بھی راگ سننے سے خوشی اور طمانیت محسوس کرتا ہیں جیسا کہ سانپ۔ابتدا سے دور حاضر تک بہت سے جنگی نغمات گائے گئے جن کا مقصد لوگوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنا ہوتا تھا۔رجز ایک جنگی ترانہ ہے جو مرثیے کا ایک اہم عنصر ہے اگر سٹریل مزاج انسان بھی نغمہ یا موسیقی سنتا ہے تو اس سے مزاج میں تبدیلی آتی ہے روایتوں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ حضرت داؤد کی آواز اس قدر دل آویز اور میٹھی تھی کہ اسے سن کر پہاڑ گونج اٹھتے تھے اور پرندے مستی میں آتے تھے ۔اختر نے بہت سی نظمیں جنگ کے موضوع پر لکھی ہیں ''نغمہ حب وطن گاتے چلو'' میں اختر ایک نغمے کے ذریعے میدان جنگ میں اپنے ساتھیوں میں جوش وجذبہ پیدا کر رہا ہے۔ملاحظہ ہو۔

نغمہ جب وطن گائے چلو
جنگ کے میدان کو گرماتے چلو
جن کو سن کر کانپ اٹھے کل جہات
جنگ کے وہ زمزمے گاتے چلو
اختر اپنے نغمہ پرجوش سے
بحر وبر کے دل کو تڑپاتے چلو[16]

اختر کبھی کبھی خود کو بت تراش کہتا ہے۔ کبھی شاعر کبھی مصور،اس حوالے سے کہتے ہیں۔

کبھی سوچتا ہوں کہ شاعر بنوں میں
تڑپ اٹھے دنیا وہ اشعار لکھو ں
قلم کی خدائی کا ساحر بنوں میں
ہو شرمندہ فطرت وہ اسرار لکھوں
کبھی سوچتا ہوں کہ بن کر مصور
بناوں وہ تصویر خون جگر سے
کہ آ جائے پردے سے چھن کر مصور
زمانے کو حیرت ہو جس کے اثر سے [17]

اختر شیرانی ایک رومانی فنکار ہے اور رومان پسند زیادہ تر عملی قدم نہیں اٹھاتا بلکہ اپنی تخیل اور سوچ کی مدد سے انقلاب لاتا ہے۔ یہاں اختر بڑا شاعر بننے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ ایسی شاعری کروں جس کے ذریعے فطرت کے وہ راز لوگوں پر منکشف کروں جس سے اب تک کوئی واقف نہ ہو اور یہ شاعری کا کمال ہے کہ وہ فطرت میں تبدیلیاں لا کر پیش کر سکتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اختر اس ارادے سے ہٹ کر مصور بننے کی آرزو کرتا ہے۔ وہ ایسی مصوری کرنا چاہتا ہے کہ جس کو دیکھ کر لوگ حیرانگی میں مبتلا ہو اور ایسا مصور صرف وہ بننا چاہتا ہے۔ وہ اپنے انداز مصوری میں اس قدر نرالا اور اچھوتا پن چاہتا ہے کہ کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یہاں غور کیا جائے تو یہ بات علم میں آتی ہے کہ شاعری اور مصوری میں ایک گہرا تعلق ہے۔ شاعر الفاظ اور قلم کے ذریعے کسی صورت بناتا ہے اور مصور رنگوں اور قلم سے۔ اس حوالے سے مرزا سلطان احمد کہتے ہیں۔

> ایک مصور تصویر کے خط و خال سے اس کی خوبصورتی اور مناسبت دکھاتا ہے اور شاعر الفاظ اور جملوں کی بندش سے اس کا اظہار کرتا ہے۔[18]

اگر کسی تصویر سے ایک نقطہ مٹایا جائے تو وہ ادھوری اور خراب ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح کسی شعر سے اگر کوئی ایک حرف بھی نکال دیا جائے تو ایک حرف کے جانے سے شعر کا پورا مطلب بدل جاتا ہے یا شعر نامکمل ہو جاتا ہے۔ اختر جوگن کے مقدس گیت اور اس وقت کے خوب صورت منظر سے بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ ایک جوگن کی موسیقی اور نغمگی سے سرور و لطف کی کیفیت حاصل کرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ فنون لطیفہ میں شامل فنون انسانی دل و دماغ کو طمانیت عطا کرتے ہیں۔

وادی میں موجزن ہے نغموں کا کیف لرزاں
ہر پھول ہر کلی پر مستی سی چھا رہی ہے
اک نہر بہہ رہی ہے تھوڑے سے فاصلے پر
گاتی ہوئی جو اپنی منزل کو جا رہی ہے
یا جل پری روپہلی موجوں کے بربطوں پر
تاروں کے دیوتا کو نغمے سنا رہی ہے
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے۔[19]

جوگن کی نغموں سے نہ صرف جنگل میں موجود ہر زرے پہ مستی چھائی ہوئی ہے بلکہ اختر بھی اس منظر سے مکمل طور پر لطف اندوز ہیں کیونکہ نغمہ اور موسیقی دل و دماغ کے لیے راحت و خوشی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ بعض

محققین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ موسیقی اور نغمگی بیمار کو شفا دیتی ہے۔ اختر رقص کو بھی پسند کرتے ہے کیونکہ جب وہ ایک جوگن کے نغمے سے اس قدر متاثر ہیں تو پھر وہ رقص اور رقاصہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ناچنا یا رقص گانے بجانے کے بعد آیا ہے۔ جب منہ سے آواز نکلی اور مختلف سر نکالے گے تو اس کے بعد انسان رقص کی طرف مائل ہوا۔ رقص میں ہاتھوں سے زیادہ پاوں پر انحصار ہوتا ہے۔

اختر رقاصہ کے رقص میں اس کے جسم کے ہر ایک حرکت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

کبھی کچھ ایسے ، جیسے وہ پھسل گئی، کبھی کچھ ایسے جیسے پھر سنبھل گئی
کبھی تڑپ اٹھی کبھی مچل گئی، عرض عجیب ماجرائے رر قص ہے [20]

رقاصہ کے رقص میں اس کے ایک ایک حرکت کو دیکھنا اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ یہ فن اپنے اندر بے شمار کشش رکھتا ہے۔ اگرچہ رقص کو بعض مذاہب میں حرام قرار دیا گیا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ فنون لطیفہ کا حصہ ہے۔

شاعری فنون لطیفہ کی بنیادی اور اہم قسم ہے۔ ایک شاعر خود بھی اس فن کو اپناتا ہے اور دوسروں میں بھی اس فن کی آبیاری اور نمود دیکھنا چاہتا ہے۔ اختر خود بھی شاعر ہے مگر اپنی کچھ نظموں میں وہ ایک عورت کو اس کی شادی سے زیادہ اس کی فن شاعری کو درست قرار دیتا ہے۔ اگرچہ شادی ایک مقدس رشتہ ہے لیکن یہاں اختر اپنے اندر شاعرانہ کلام سے محبت جتا رہا ہے۔ اختر ایک رومانی شاعر ہے اور رومان پسند اپنے جذبات کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ بقول منشی امیر احمد صاحب علوی:

انسانی جذبات لطیف کا منظوم و منقیٰ عبارت میں اظہار شاعری کہلاتا ہے۔ [21]

جب انسان اپنے خوب صورت جذبات جو اس کے اندر پنپ رہے ہیں۔ کو ہم قافیہ الفاظ کا لباس عطا کریں تو وہ شاعری یا پھر منظوم شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ قدرت کی جانب سے شاعر کو یہ تحفہ ملا ہے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کو ضبطِ تحریر میں لا سکتا ہے۔ اختر کے ہاں ایک ایسی عورت ہے جس کی شادی ہوئی لیکن وہ اس کی شاعرانہ زندگی اور شادی شدہ زندگی پر اپنے جذبات کی عکاسی یوں کرتا ہے:

شعر کی گود میں پلتی تھی جوانی تیری
تیرے شعروں سے ابلتی تھی جوانی تیری
شرکت غیر سے بیگانہ تھے نغمے تیرے
عصمت حور کا افسانہ تھے نغمے تیرے [22]

اختر عورت کی شاعرانہ زندگی کی تعریفیں بیان کرتا ہے۔ انھیں لگتا ہے کہ پہلے اس کی جوانی پاک وصاف تھی جہاں کسی غیر کا گزر نہ تھا اور اس کے نغمے پاکیزہ تھے لیکن اس کی شادی کے بعد کچھ یوں کہتے ہیں:

شعر و رومان کے وہ خواب کہاں ہیں تیرے؟
وہ نقوش گل و مہتاب کہاں ہیں تیرے؟
کون سی طرف ادا بھا گئی اس دنیا میں؟
خلد کو چھوڑ کے کیوں آگئی اس دنیا میں؟[۲۳]

اختر کو اس بات کا افسوس ہے کہ شاعری کی دنیا سے ایک چمکتا ہوا چاند جس کے ارد گرد رومانی تصورات کے ستارے چمکتے تھے۔ اب اس جنت میں نہیں ہے بلکہ یہاں سے چلی گئی ہے اور اپنے جذبات کا اظہار سوالیہ انداز میں کر رہا ہے۔ وہ مزید عورت سے مخاطب ہے کہ:

تیرگی، حرص کی، حوروں کی بھی بہکا ہی گئی
تیرے بستر پہ بھی آخر کو شکن آہی گئی
اب نہیں تجھ میں وہ حوروں کی سی عفت باقی
حور تھی تجھ میں، گئی، رہ گئی عورت باقی[۲۴]

عورت جب شاعرانہ زندگی گزار رہی تھی۔ وہ ہر قسم کے عیب سے پاک تھی جس طرح جنت کی حور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پاک وصاف ہے۔ اختر کے خیال میں جب تک وہ شاعری کر رہی تھی اور فنون لطیفہ کی دنیا میں ایک بیش بہا اضافہ کر رہی تھی تو وہ ہر قسم کے عیب سے پاک تھی لیکن جب سے وہ کسی غیر کی تحویل میں آئی تو اس میں حوروں والی پاکبازی ختم ہوئی اور اس کے اندر سے صرف ایک عورت نمودار ہوئی۔ جس کے پاس دنیا کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔

اختر رومانی فنکار ہونے کے ناطے اپنے ارد گرد ایک ایسی دنیا آباد کرتے ہیں جہاں تکالیف و مصیبتوں کا دور دور تک گزر نہیں ہوتا۔ جہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں نظر آتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

یہ موسیقی جو رقصاں ہے پرندوں کی صداؤں میں
یہ نغمے، یہ ترانے، یہ شراب، شعر کا عالم[۲۵]

اختر فنون لطیفہ میں موجود ہر فن کو دل سے چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں ان فنون کو تلاش کرتے ہیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ انہیں ایک فرحت بخش موسیقی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے ارد گرد نغموں اور شراب و شاعری کے محفلوں میں وہ سکون محسوس کر رہے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ:

یہ آرائش مکانوں کی، یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی، یہ محبت نازنینوں کی
نہ لے جا خلد میں یارب، یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو[۲۶]

اختر اپنے ارد گرد ایک حسین دنیا آباد کرتے ہیں جہاں عالی شان عمارتیں ہیں جس میں حسین و جمیل لوگوں کا بسیرا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش میں خوب صورت لوگوں کی محبت پا کر بہت خوش ہے اور اپنے رب سے جنت کی آرزو نہیں کرتے کیوں کہ اس کی دنیا اس کے لیے کسی جنت سے کم نہیں۔

اختر نے فنون لطیفہ ہی کی بدولت اپنی دنیا خوب صورت بنائی ہے کیوں کہ اسے اس بات کا علم ہے کہ ان فنون کی تکمیل اور ترقی ہی سے دنیا آباد ہے۔ اگر ان فنون کو ترک کیا جائے تو دنیا کسی ویرانے سے کم نہ ہو گی۔

حوالہ جات

۱۔ مرزا سلطان احمد، فنون لطیفہ (لاہور: یونین سیٹم پریس، ۱۹۱۲ء)، ص ۱۱۔

۲۔ Angus Stevenson ,*Oxford Dictionary of English* (Third Edition), Printed in Italy by L.E.G.O.S.P.A Lavis (TN)

۳۔ سید مجید اللہ، آرٹ (حیدر آباد دکن: ادارہ اشاعت، ۱۹۷۹ء)، ص ۶۔

۴۔ غلام یزدانی، دکھنی آرٹ پر دو مقالے (الہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی اتر پردیش، ۱۹۵۴ء)، ص ۱۔

۵۔ سیما پرویز، آرٹ کی کہانی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فراغ اردو زبان ۱۹۹۸ء)، ص ۹۔

۶۔ شکیل الرحمن، اقبال اور فنون لطیفہ (دہلی: لاہوتی پرنٹنگ پریس، س ن)، ص ۸۹۔

۷۔ یونس حسنی (مرتب) اختر ستان (لاہور: بک پرنٹر ۱۹۹۳ء)، ص ۱۱۰۔

۸۔ یونس حسنی (مرتب) کلیات اختر شیرانی (لاہور: پرنٹ بارڈ پرنٹرز، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۹۔

۹۔ خلیق دہلوی، ادبستان (لاہور: کتب خانہ ناشر العلوم، ۱۹۳۰ء)، ص ۹۔

۱۰۔ یونس حسنی (مرتب) اختر شیرانی اور جدید اردو ادب (کراچی: پرنٹرز پبلیشرز ۲۰۰۹ء)، ص ۱۶۹۔

۱۱۔ یونس حسنی (مرتب) کلیات اختر شیرانی (لاہور: پرنٹ یارڈ پرنٹرز، ۲۰۰۹ء)، ص ۳۸۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۹۔

۱۳۔ یونس حسنی (مرتب) اختر ستان، ص ۴۶۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۹۔

۱۵۔ یونس حسنی (مرتب) اختر ستان، ص ۳۳۔

۱۶۔ یونس حسنی (مرتب) کلیات اختر شیرانی، ص ۸۹۸۔

۱۷۔ یونس حسنی (مرتب) شہرود (لاہور: بک پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۷۔

۱۸۔ مرزا سلطان احمد، فنون لطیفہ، ص ۱۱۰۔

۱۹۔ یونس حسنی (مرتب) کلیات اختر شیرانی ص ۳۰۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۹۔

۲۱۔ منشی امیر احمد صاحب علوی، اردو شاعری (لکھنؤ: سرفراز پریس، س۔ندارد)، ص ۲۔

۲۲۔ یونس حسنی (مرتب)، کلیات اختر شیرانی، ص۱۲۹۔

۲۳۔ ایضاً، ص۱۳۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۳۱۔

۲۵۔ یونس حسنی (مرتب)، اختر ستان (لاہور: بک پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ص۱۳۷۔

۲۶۔ ایضاً، ص۱۳۷۔

ماحصل

زمانہ قدیم سے لے کر موجودہ دور تک تہذیب کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے۔لفظ تہذیب کے اندر ان گنت چیزیں آتی ہیں۔ جو انسانی زندگی کی بنیاد ہیں ۔جس میں انسان کی حرکات ،انسانی گفتگو کا انداز ،عقائد ،خیالات،اخلاق وادب، رہن سہن، عبادت اور سیاست وغیرہ شامل ہیں۔ابتدا سے لے کر دور حاضر تک انسان نے اپنی خوشی اور آرام کے لیے کچھ اصول بنائے ہیں اور یہی اصول اس کی تہذیب کہلائی۔ہر خطے کی تہذیب دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔

شاعری تہذیب کے سایہ میں سفر کرتی ہے۔شاعری کسی بھی علاقے کے رسم ورواج، سماجی تعلقات،تاریخ عشق ومحبت اور فکر وشخصیات کو قبول کرتی ہے۔اس ضمن میں اردو ادب کے شعرا نے اپنی نظموں میں ہندووں کی تہذیب وثقافت اپنے مسلم معاشرے کے سماجی تعلقات کو ایک نئے اور اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ہمارے معاشرے میں جو سماجی اقدار ہوتے ہیں وہ کسی قانون کے نافذ کردہ نہیں ہے بلکہ ان اقدار کے پیچھے تاریخ روایات کی ایک لڑی دکھائی دیتی ہے۔معاشرے کے تجربات اور مشاہدات اس کے پیچھے کی شان ہوتے ہیں۔ معاشرے میں موجود افراد اپنے سماجی اقدار پہ عمل پیرا ہوتے ہیں۔

ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کی تہذیب وثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ تہذیب کا وجود زمانہ قدیم سے دور جدید تک سفر کرتا آگیا۔ جنگلی انسان سے لے کر آج کے مشینی انسان تک یہ سفر مختلف تبدیلیوں سے گزر کر ایک سیلاب کی طرح بہتا گیا۔ تہذیب کے اس سیلاب سے کوئی شاعر یا ادیب بچ نہیں سکا کیوں کہ شاعر وہ دیدہ بینا قوم ہے، جو بہت تیزی سے خارج سے اثر لیتا ہے۔ہر عہد کے شاعر نے خود کو اپنے ارد گرد کے حالات سے باخبر رکھا اور انہی حالات وواقعات کو صفحات میں قلم بند کیا۔عالمی سطح پر ٹینی سن، ملٹن، سارتر اور میکسم گورگی جیسے ادیب ہو یا نظیر، سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض جیسے بڑی تخلیقی شخصیات ہو سب نے اپنے تہذیبی اثرت کو قبول کر کے کتابوں میں دفن کیے۔اردو ادب کے دور جدید اور دور قدیم کے شعرا نے اپنی نظموں کی حسین تصاویر کو کتابوں میں سجایا ہے جن کو اکٹھا کر کے ان کے عہد کی تہذیب وثقافت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ نظیر، اقبال اور حالی کے بعد اور بھی نظم گو شعرا آئے جنھوں نے اردو نظم میں تہذیبی عناصر کے خوبصورت رنگ بکھیر دیے۔ان میں جوش ملیح آبادی، ناصر کاظمی، اختر شیرانی، منیر نیازی، افتخار جالب، احمد ندیم قاسمی، ن-م راشد میراجی وغیرہ اہم نام ہیں۔

عشق ومحبت تہذیب وثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔اگر دنیا سے اس جذبے کو ختم کیا جائے تو سارے نظام کا چلنا ناممکن ہو جائے گا۔اختر کو تنقید نگاروں نے عشق ومحبت کا حامل شاعر کہا ہے۔ابتدا ہی سے آپ عاشق مزاج اور

حسن پرست انسان ہیں۔ آپ کی نظموں میں دوسرے پہلوؤں کی بہ نسبت رومان زیادہ پہلا ہوا ہے۔ وہ عشق و محبت کے نغمے گاتا ہے مگر وہ صرف اپنی محبوبہ اور عورت کو نہیں پکارتا نہ صرف عورت کے عشق میں مبتلا ہے بلکہ مذہبی اور قابل قدر شخصیات سے بھی والہانہ عشق کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں وہ کسی بڑے مذہب پرست کے پیچھے نہیں ہیں۔ ذاتی امور کے علاوہ سماجی معاملات کے لیے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اپنے آخری نبی اور دوسرے صحابہ کی مدح میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ''اذان'' جیسے بہترین موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اختر کی شاعری دونوں جنگ عظیم کے درمیان سامنے آتی ہے۔ اس وقت حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ ہر شخص سیاست میں حصہ لے رہا تھا ۔اختر کو بھی اپنے وطن سے محبت ہے۔ اختر آزادی کے طرفدار اور عاشق تھے کئی نظموں میں خود کو وطن پہ قربان ہونے کی آرزو کی ہے۔ اختر نے جنگ کے موضوع پر کئی نظمیں لکھی ہیں جن میں جنگی ترانہ، نعم البدل اور دلیران وطن قابل ذکر ہیں۔ ختر اردو ادب کا وہ رومانی ستارہ ہیں جنہوں نے اپنے عشقیہ معاملات کو کھلم کھلا بیان کیا۔ چاہے وہ محبوب سے وصل کا وقت ہو، یا ہجر کی رات کا یا پھر محبوب کی یاد کا اختر نہ صرف موجود لمحات میں اپنی محبوبہ سے عشق کرتا ہے بلکہ وہ بیتے ہوئے دنوں کو بڑی خوب صورتی سے بیان کرتا ہے ۔ اگرچہ اختر سے پہلے دوسرے نظم گو نے عشقیہ معاملات کو بیان کیا لیکن اختر کے ہاں اس میں پوری شدت ہے۔

مجموعی طور پر اختر کی زیادہ تر نظمیں رومانی ہیں لیکن رومان کے پردے میں انہوں نے معاشرے کے سماجی رویوں اور سماج کے افراد کے تعلقات کو واضح کیا ہے۔ آپ رومانیت کے ساتھ حقیقت پسندی سے بھی نظریں نہیں چراتے۔ انہوں نے رومانی نظموں میں سماج سے جڑے حالات و واقعات کی عکاسی بڑی خوب صورتی سے کی ہے۔ سماج میں موجود اچھائیوں کو سراہتے ہیں اور برائیوں پر نظر ڈال کر ان کو برا کہتے ہیں۔ ان برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سماجی تعلقات کی بہتری کی کوشش کرتے ہیں اور سماجی اصطلاح چاہتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا خلوص نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اختر شیرانی عشق و محبت جیسے جذبے کو ایک انوکھے اور منفرد انداز میں سامنے لاتے ہیں۔ ان کا یہ انداز انہیں دوسرے رومانی فنکاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اختر کی نظمیں ان کی زندگی کی تشریح و تفسیر ہے۔ اپنے زمانے اور عہد کے تقریباً ہر رجحان کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ ان کی نظمیں ذاتی زندگی کے علاوہ ان کے عہد کے حالات کی ترجمان ہیں۔

اختر نے شاعری کے مختلف اصناف میں طب آزمائی کی۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نظم میں ہیت کے نئے تجربے کیے۔ رومانی تحریک کے اہم رکن کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ اس وقت ان کی مقبولیت کا ستارہ چمکا جب اقبال جیسے بڑے شاعر اپنی قابلیت کی بنا پر دنیا بھر میں شہرت حاصل کر رہے

تھے۔اتنے بڑے شاعر کی موجودگی میں شہرت حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ مختصر یہ کہ اختر نے اپنے منفرد کلام سے اردو شاعری کو بڑی حد تک متاثر کیا۔

اردو نظم میں ہر عہد کے شاعر نے اپنے زمانے کے رسم ورواج پر روشنی ڈالی ہے۔اختر شیرانی کا نام سنتے ہی قاری کا ذہن سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ کی گھنی زلفوں اور شبنمی عارضوں میں الجھ جاتا ہے لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو زندگی صرف رومان کا نام نہیں ہے بلکہ زندہ رہنے کے لیے انسان کو اور چیزوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔اختر اس معاشرے کا ایک سانس لیتا ہوا انسان تھا اور اس دنیا کے رسم رواج کی پیشکش موسیقی اور غنائی الفاظ میں کی ہے۔ شادی اسلام کا ایک اہم عنصر ہے اور اس کے لیے اسلام نے بہت سادہ شرائط رکھے ہیں ہر دور میں اس کی ادائیگی کے لیے مختلف مراحل ہوتے تھے۔ کوئی اس میں بہت سی رسموں کا اہتمام کرتا تھا جس میں ہندو کے بعض رسموں کا میل ملاپ ہو جاتا اور کچھ لوگ باقاعدہ اسلامی طور طریقوں کو اپناتے تھے۔جب حضرت فاطمہ کا نکاح ہوا تو بہت سادگی بھرتی گئی۔اس طرح حضرت عائشہ کی شادی کی رسم سادگی سے ادا کی گئی جس میں اسراف نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

تہذیب کے عناصر رسم ورواج اور تاریخ کی پیش کش اختر کی نظموں میں نمایاں ہے۔اختر کے ہاں زیادہ تر ہندوستانی معاشرے کے رسم ورواج کی عکاسی ملتی ہے۔ عورت کی شادی، پردے سے لے کر شب برات اور عید الفطر تک کے موضوعات پہ طبع آزمائی کی۔ دوسری طرف تاریخ کو بھی ساتھ لے کر چلے ہیں۔اور یہی ایک کامیاب شاعر کا خاصہ ہے۔انہیں اس بات کا علم ہے کہ کوئی بھی قوم اپنی تاریخ سے کٹ کر آگے نہیں بڑھ سکتی۔

اقبال فنون لطیفہ میں زندگی کی حرارت دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس آرٹ کے خلاف ہیں جس سے قوموں میں مردنی چھائے بلکہ وہ اس فن کے خواہش مند ہیں جو قوموں کو ترقی کی رہ پر گامزن کریں اور یہی وہ آرٹ ہے جو صدیوں بعد یعنی زندہ جاوید ہوتا ہے۔

فنون لطیفہ (شاعری، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی، فن تعمیر اور رقص) کا جنس سے ایک گہرا تعلق ہے۔ فارسی اور اُردو شاعری میں جنسی لگاؤ دوسری زبانوں کی نسبت زیادہ ہے۔ غزل اُردو ادب ایک جز ہے اور شاعری کی جان بھی اسکے معنی ہی عورتوں سے باتیں کرنا ہے۔اس میں محبوب کی تعریف بیان کی جاتی ہے۔اگر غور کیا جائے تو ان سب مضامین میں کہیں نہ کہیں جنسی لگاؤ نظر آتا ہے۔اُردو ادب کے مشہور شاعر غالب کے کلام میں اس قسم کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔تاریخ پر نظر دوڑانے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یونان اور دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی بازاری عورتوں سے عشق و محبت کو عار نہیں سمجھا جاتا تھا۔اس لیے ہماری شاعری میں عورتوں کے حسن و جمال کے راگ تقریباً ہر شاعر نے الاپے ہیں۔ داغ دہلوی کی شاعری میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔اُردو شاعری میں مرد اور عورت کے عشق کے علاوہ مرد کا مرد سے عشق کی مثالیں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ میر تقی میر جیسے سنجیدہ شاعر نے اسکا اظہار

اپنے کلام میں کیا ہے۔ مثلاً لڑکے کی بھیگی مسیں، اسکا سبزہ خط اور اسکے چہرے کے خدو خال کی تعریف۔ شاعری سے ہٹ کے اگر مجسمہ سازی کو دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہوئی ہے کہ فنکاروں نے نہ صرف عورتوں کے حسن کو بیان کیا بلکہ ان کے فن میں چھپا ان کا جنسی جذبہ واضح جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر یونان کے پرانے مجسموں اور اجنٹا کی دیواروں پر بنی مصوری میں عورت کی تصاویر ایک طرف جمالیات کو سامنے لاتی ہے تو دوسری طرف ان میں جنسی خمیر کارفرماں ہے۔ مصوری اور مجسمہ سازی میں جنسی لگاؤ کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ اگر ہم آرٹ کی خوبصورتی سے ہٹ کر عورت کی عریاں تصاویر کو دیکھے تو محسوس ہوتا ہے۔ کہ انسان کی جنسی خواہشات آرٹ کے دامن میں چھپے ہوئے ہیں۔ اردو ادب کے رومانی شاعر اختر کو دیکھا جائے تو نظموں میں کبھی کبھار اپنی محبوباوں کے ذکر میں لذت پسندی کا اظہار کرتے ہیں۔

اختر اپنی نظموں میں ایک مصور کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ مرقع نگاری اور بت تراشی ان کی نظموں میں نمایاں ہیں۔ بقول اختر اورینوی، اختر کیٹس کی طرح الفاظ سے بت گری بھی کرتے ہیں۔ اختر نہ صرف جاندار اور سانس لیتی چیزوں کی بت گری کرتا ہے بلکہ غیر مرئی اشیا کو بھی جاندار کا روپ دینے میں ماہر ہیں۔

اختر شیرانی ایک رومانی شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں حیات و کائنات کے مسائل پر گہرائی سے بحث نہیں ملتی نہ کسی قسم کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں قنوطیت کی بجائے رجائیت کی حامل نظمیں ہیں۔ جو زندگی سے محبت سکھاتی ہیں۔ ان کی نظموں میں تہذیب و ثقافت کے عناصر کو آرام سے دیکھا جاسکتا ہے کوئی بھی انسان اپنی تہذیب سے نظریں نہیں چرا سکتا مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوا کے اختر شیرانی کی رومانی نظموں میں تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں جابجا ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رومان تہذیب کا ایک عنصر ہے۔

کتابیات

احد، علی، محمد۔تاریخ تمدن۔لکھنو:الناظر پریس،۱۹۱۷ء۔

افتخار، محمد شفیع۔اصناف شاعری۔لاہور: عمر، عثمان، شفیق پرنٹرز۲۰۱۸ء۔

ایس پٹیل، احمد، غلام ابرابر صدیقی۔سماجی زندگی۔دہلی: مطبوعہ نعمانی برقی پریس،۱۹۵۱ء۔

اقبال، علامہ۔کلیات اقبال ۔دہلی:ایجوکیشنل ہاوس،۲۰۱۴ء۔

اختر،ایس جعفری۔اختر شیرانی اور اس کی شاعری۔لاہور:اشرف پریس۱۹۴۷۔

اللیث،ابوصدیقی۔تجربے اور روایت۔کراچی:ایجوکیشنل پریس،۱۹۵۹ء۔

احمد، محمد فلاحی۔ہند ومسلم کی خوشگوار یادیں۔دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشر۲۰۰۴ء۔

امجد، ساجد۔اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات۔لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء۔

اللیث،ابوصدیقی۔امراؤ جان ادا تنقیدو تبصرہ ۔اعجاز پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۲ء۔

اکبرآبادی سیماب۔سوانح نور جہاں بیگم۔آگرہ:الیکٹرک ابوالعلائی پریس۱۹۲۰ء۔

احمد، سلطان۔فنون لطیفہ ۔لاہور:یونین سیٹم پریس۱۹۱۲ء۔

الرحمٰن، شکیل۔اقبال اور فنون لطیفہ۔دہلی:لاہوتی پرنٹنگ پریس، س ن۔

آزاد، فتح پوری اسماعیل۔اردو شاعری میں نعت ابتدا سے محسن تک ۔لکھنو: نسیم بک ڈپو، ۱۹۹۲ء۔

بریلوی، عبادت۔خطبات عبدالحق بحوالہ ہندی اردو تنازعہ ۔نیشنل بک فاونڈیشن۱۹۷۵ء۔

بخاری صیح برقم(۶۰۱۱)،صیح و مسلم :(۲۵۸۶)۔

بابو، رام سکینہ۔تاریخ ادب اردو۔لاہور:۔پرنٹ یارڈ پرنٹرز،۲۰۱۸ء۔

بریلوی، عبادت۔تنقیدی زوایے۔لاہور:انشا پریس۱۹۵۱ء۔

بریلوی، عبادت۔جدید شاعری ۔لاہور:اشرف پریس،۱۹۶۱ء۔

بینٹن، ولیم۔انسائیکلو پیڈیاآف برٹا نیکا(جلد پنجم)۔لندن:۱۹۶۵ء۔

بدرالدین، مولانا الحافظ قاسمی(مترجم)۔حضرت علی ایک عقبری شخصیت۔دہلی: مکتبہ وحیدیہ، ۲۰۰۵ء۔

پرویز، سیما۔آرٹ کی کہانی۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۱۹۹۸ء۔

جمیل،خاور۔نوائے سروش۔دہلی:انٹرنیشنل اردوفاونڈیشن،۲۰۰۱ء۔
جمیل،خاور(مرتب)ادب کلچر اور مسائل ۔کراچی شیخ سلطان ٹرسٹ پریس،۱۹۸۶ء۔
جیلانی،غلام برق۔ہماری عظیم تہذیب۔لاہور:شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز ۱۹۷۱ء۔
جالبی، جمیل۔تاریخ ادب اردو(جلداول)۔لاہور:پرنٹ یارڈپرنٹرز،۲۰۱۸ء۔
حسن،سبط۔ماضی کے مزار۔کراچی:مکتبہ دانیال ۱۹۹۶ء۔
حسن،سبط۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقا۔کراچی:کتب پرنٹرزوپبلشرز ۱۹۷۵ء۔
حضر،راناسلطان(مرتب)۔کلیات نظیر اکبر آبادی ۔لاہور:پرنٹ یارڈپرنٹرز ۲۰۰۷ء۔
حسین،الطاف حالی۔مسدس حالی۔لاہور: پرنٹ یارڈپرنٹرز ۲۰۱۶ء۔
حسین،الطاف،حالی۔کلیات حالی۔دہلی:پیام وطن پریس،۱۹۶۰ء۔
حسنی،یونس۔اختر شیرانی اورجدیداردو ادب۔کراچی:پرنٹرزوپبلیشرز ۲۰۰۹ء۔
حسنی،یونس(مرتب)۔کلیات اختر شیرانی۔لاہور:پرنٹ یارڈپرنٹرز،۲۰۰۹ء۔
حیدر،غلام،میرے استاد ۔دہلی:لبرٹی آرٹ پریس پٹوری ہاوس،۲۰۰۹ء۔
حسنی،یونس(مرتب)۔نغمہ حرم۔لاہور:پرنٹ یارڈپرنٹرز،۱۹۹۳ء۔
حسنی،یونس(مرتب)۔پھولوں کے گیت۔لاہور:بک پرنٹرز،۱۹۹۳ء۔
حسین،احتشام۔تنقید اور عملی تنقید۔لکھنو:سرفراز قومی پریس لکھنو،۱۹۶۱ء۔
حسنی،یونس(مرتب)اختر ستان۔لاہور:بک پرنٹر ۱۹۹۳ء۔
حسنی،یونس(مرتب)۔شہناز۔ لاہور:بک پرنٹنگ پریس،س ن۔
حسنی،یونس(مرتب)۔شہرود۔لاہور:بک پرنٹرز ۱۹۹۳ء۔
حسنی،یونس(مرتب)۔صبح بہار۔لاہور:بک پرنٹرز،۱۹۹۳ء۔
خان،سرسیداحمد، مقالات سرسید ۔لاہور:۱۹۶۲ء۔
دستگیر،غلام رشید۔اسلامی تہذیب کیا ہے؟ ۔لاہور:اتحادپریس،۱۹۴۹ء۔
دہلوی، خلیق۔ادبستان۔لاہور:کتب خانہ ناشر العلوم ۱۹۳۰ء۔
راشد،محمد بھٹی،۔مطالعہ تہذیب اسلامی۔لاہور:اردوبازار،۱۹۶۹ء۔
زوایے، ادبی‌کل پاکستان اہل قلم کانفرس ۱۹۸۳ کے مقالات کا مجموعہ۔اکادمی ادبیات پاکستان۔

شمش الدین، محمد صدیقی (مرتب) رسالہ۔خیر و برکت کی شادی ۔حیدر آباد دکن، س،ن۔
عبدالقادر، عمادی۔سماج اور تعلیم ۔دہلی: راکیس پریس، ۱۹۷۷ء۔۱۸۹۹ء۔
عبدالمجید، خواجہ (مرتب)۔مصباح اللغات۔لاہور: جامع االلغات کمپنی، س ن۔
عمر، محمد، ہندستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر ۔نئی دہلی: پبلی کیشنز ڈویژن بار دوم ۱۹۹۵ء۔
کرمانی، شمیم۔ذو الفقار۔لکھنو: احباب پبلشرز، ۱۹۶۴ء۔
گورکھپوری، مجنون۔ادب اور زندگی۔علی گڑھ: اردو گھر، ۱۹۸۴ء۔
مولوی، الحاج فیروز الدین (مرتب)۔فیروز اللغات اردو۔لاہور: ظہیر اسلام پرنٹرز و پبلیشرز، س ن۔
مثالی، یوسف (مرتب)۔ شرح کلیات اقبال۔لاہور: ۔پرنٹ یارڈ پرنٹرز، ۲۰۱۸ء۔
ولی میر، الدین صاحب۔رموز عشق۔دہلی: نیو لیتھواٹ پریس، ۱۹۸۱ء۔
واسطی، نیر۔سلمیٰ سے دل لگا کر۔دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاوس، ۱۹۸۰ء۔
واصل، محمد عثمانی۔ماں ۔دہلی: عاکف بک ڈپو، ۱۹۹۰ء۔